دریچے
ہیں سبھی
حیرانی
احمد زین الدین

اُردو افسانے نے لگ بھگ ایک صدی کے سفر میں مختلف مراحل طے کئے۔ اس سفر میں گوناگوں سماجی اور اقتصادی موضوعات کے دوش بدوش اسالیب اور پیرائے اظہار میں بھی نت نئے تجربات کئے گئے۔ احمدزین الدین کا شمار ان قابلِ ذکر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھیں اُردو افسانے کے ارتقائی سفر کا بخوبی ادراک ہے۔ انھوں نے مشاہدے اور تجربے سے اپنے افسانوں میں زندگی کی ہلچل اور گہماگہمی کو برقرار رکھا۔ دید و دریافت سے ان میں توانائی اور تازگی پیدا کی۔ موضوعات میں تنوّع کے ساتھ ساتھ جدید سے جدید تر اسلوب اختیار کیا۔ اس کوشش میں وہ کامیاب و کامران نظر آتے ہیں خصوصیت کے ساتھ ان افسانوں میں جو سابق مشرقی پاکستان کے معروضی حالات کے تناظر میں لکھے گئے۔ وہاں کے سماجی اور اقتصادی حالات کو انھوں نے ایک دیدہ ور کی حیثیت سے دیکھا، سمجھا اور ان کا تجزیہ کیا۔ اپنی تخلیقی صلاحیت سے اس طرح افسانوں کے رُوپ میں پیش کیا کہ زندگی کے مختلف رُخ اور مختلف پہلو نمایاں ہو کر سامنے آگئے۔

احمدزین الدین مشّاق افسانہ نگار ہیں۔ لکھنے کا فن جانتے ہیں۔ تخلیق کے عمل میں موضوع کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں اور اس کے اظہار و ابلاغ کے لئے وہ اسلوب اختیار کرتے ہیں جو موضوع سے مطابقت اور ہم آہنگی رکھتا ہے۔ احمدزین الدین کے فکر و فن کا ارتقائی عمل جاری ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ بہتر سے بہتر افسانے لکھتے رہیں گے اور ادب میں وہ مقام حاصل کرلیں گے جس کے وہ اہل ہیں۔

(شوکت صدّیقی)
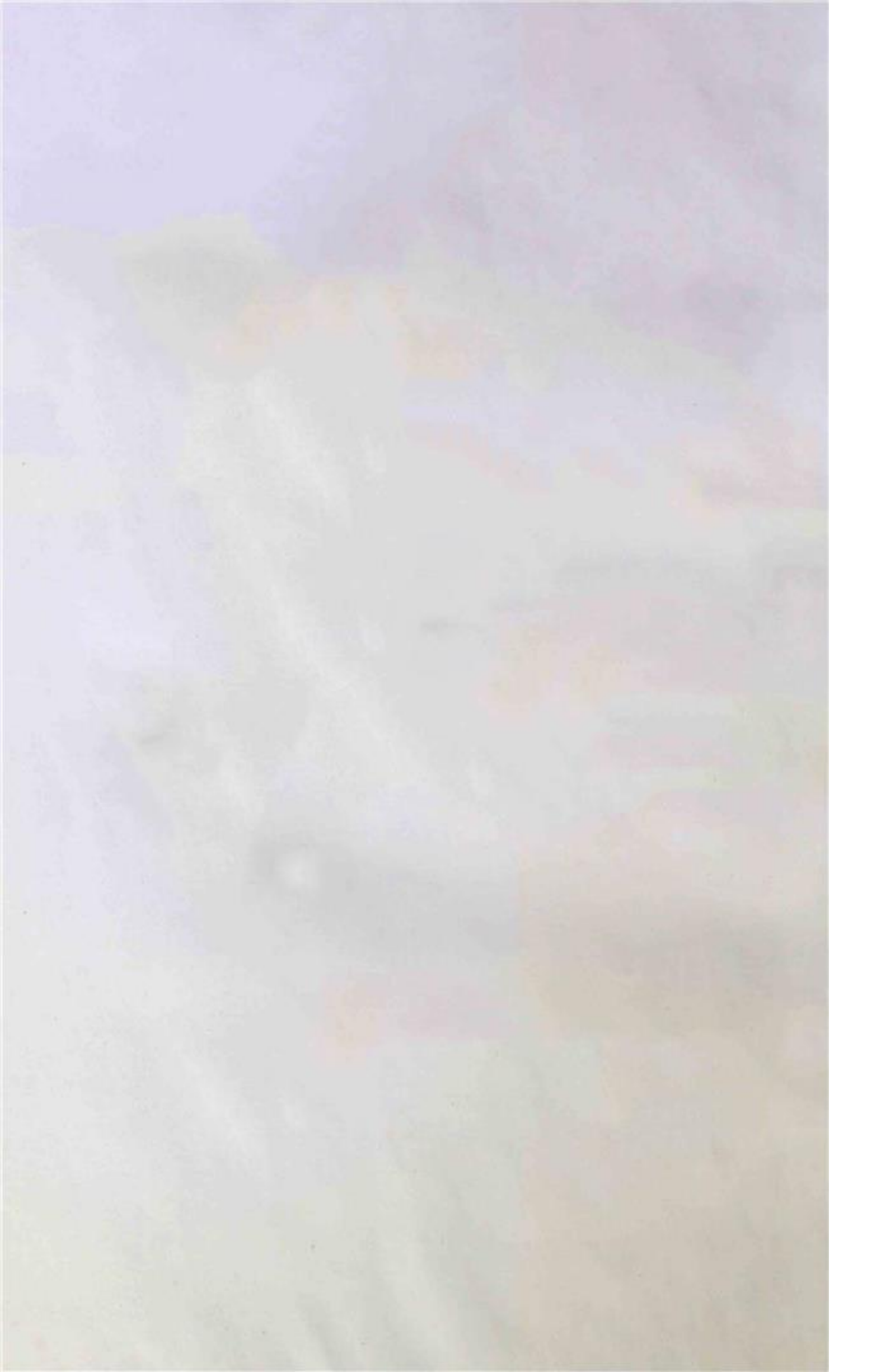
بسم الله الرحمن الرحيم

فن کے پیمانے سُبک، حرف کے کوزے نازک
کیسے سمجھاؤں کہ کچھ دُکھ ہیں، سمندر میرے

محشر بدایونی

دریچے میں سجی حیرانی

افسانے

احمد زین الدین

بہ اہتمام فکشن گروپ کراچی

نام کتاب ـــــــ دریچے میں بھی حیرانی

مصنّف ـــــــ احمد زین الدّین

اشاعتِ اوّل ـــــــ جنوری ۱۹۹۷ء

تعداد ـــــــ ۱۰۰۰ (ایک ہزار)

قیمت ـــــــ ۱۵۰ روپے

کتابت ـــــــ جاوداں لیزر کمپوزرس، ۲۸ ایچ رضویہ سوسائٹی کراچی

فون: ۶۲۵۴۶۲ : ۶۷۶۵۳۲

طابع ـــــــ اوکھائی پرنٹنگ پریس کراچی

سرورق ـــــــ بشیر موحّد

ناشر ـــــــ منظر پبلی کیشنز

اے ۳۶ واجد اسکوائر، بلاک ۱۶ گلشن اقبال کراچی

تزئین ـــــــ سیّد تصویب حسین نقوی

اِنتساب

اپنے بڑے بھائی جناب محی الدین صدیقی مرحوم

اور

اپنی شریکِ حیات حمیدہ خاتون شبنم

کے نام

حالانکہ اِن دونوں شخصیتوں نے میری افسانہ نگاری کے شوق کو کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا، لیکن بھائی جان کی سخت تربیت اور بیوی کی رفاقت نے خاموش انداز میں میری تخلیقی توانائی کو جلا بخشی۔

ذات کا آئینہ

نام	:	زین الدین احمد صدیقی۔
قلمی نام	:	احمد زین الدین۔
والد کا نام	:	مولوی عبدالستار مرحوم۔
تاریخ پیدائش	:	۲۲ جولائی، ۱۹۳۹ء (مطابق میٹرک سرٹیفیکیٹ)۔
جائے پیدائش	:	قصبہ بھتری، تحصیل سید پور، ضلع غازیپور (یو۔پی)، انڈیا۔
تعلیم	:	ایم۔اے (ادبیاتِ اردو)، ڈھاکا یونیورسٹی، ۱۹۶۵ء .... ایم۔اے (انگریزی ادبیات)، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۷۶ء۔
پہلی ملازمت	:	ڈھاکا الیکٹرک سپلائی کمپنی، ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۰ء، میٹرک کے فوراً بعد۔
دوسری ملازمت اور عہدہ	:	پاکستان ٹیلیگراف اینڈ ٹیلیفون ڈیپارٹمنٹ، ڈھاکا، ۱۹۶۰ء تا حال بحیثیت اکاؤنٹس آفیسر، ناظم آباد زون، کراچی۔
جز وقتی ملازمتیں	:	○ شاہین اسکول، پاکستان ایئر فورس، ڈھاکا۔ درس و تدریس۔ ○ ہفت روزہ "چترالی" .... پاکستان آبزرور گروپ آف نیوز پیپرز، بحیثیت سب ایڈیٹر۔

○ روز نامہ "پاسبان" ڈھاکا، بحیثیت سب ایڈیٹر۔

○ روز نامہ "وطن" ڈھاکا، بحیثیت سب ایڈیٹر۔

○ روز نامہ "سویرا" کراچی، بحیثیت سب ایڈیٹر۔

○ نیوز ریڈر، ریڈیو پاکستان، ڈھاکا۔

○ لکچرار، سراج الدولہ کالج، کراچی۔

○ انشورنس کارپوریشن آف پاکستان، ڈھاکا۔

مختلف کورس : سول ڈیفنس کے کئی ابتدائی کورسز، کراچی۔

ایر ٹکٹنگ کورس، کراچی

پہلی ہجرت : ۱۹۵۱ء مشرقی پاکستان، ڈھاکا۔

دوسری ہجرت : وسطِ جون، ۱۹۷۱ء اور مستقل قیام کراچی۔

مستقل پتہ : فلیٹ نمبر A-8 ، ندیم کارنر، بلاک "این" شمالی ناظم آباد، کراچی۔

فون نمبر ۶۶۴۵۱۷۷، ۶۶۷۹۷۹۶} گھر۔

رکن مجلسِ ادارت : ○ "جوئبار" ..... شعبہ اردو و فارسی، ڈھاکا یونیورسٹی، سرپرستِ اعلیٰ ڈاکٹر عندلیب شادانی (شعبے کی تاریخ کا پہلا مجلہ، جو ۴۵ سال کے بعد شائع ہوا)۔

○ "دائرہ" ڈھاکا، مدیر: شاہد کامرانی

○ ینگ چینل، کراچی

بحیثیتِ مدیر : ○ ماہنامہ "شناور" کراچی۔

تنظیمی وابستگی : انجمن ادب ڈھاکا ○ بزمِ اردو ڈھاکا ○ حلقہ آہنگِ نو کراچی۔

○ دبستانِ حرا، کراچی۔

○ افسر ماہ پوری میموریل اکیڈمی۔ کراچی

○ فکشن گروپ، کراچی۔

○ گوشہ ادب ڈھاکا

تخلیقی کاوشیں ○ صوفیہ لارین کی مکمل سوانح حیات، انگریزی سے اردو میں۔

تلخیص و ترجمہ : کرسٹن کیلر کی مکمل سوانح حیات، انگریزی سے اردو میں۔

○ شہرۂ آفاق انگریزی مصنفین کی کہانیوں کے ترجے۔

○ بنگلا کہانیوں کے ترجے

مضامین ، تبصرے ، ○ مستقل فکاہیہ کالم، بعنوان "حرف بہ حرف" فلمی شخصیات پر فکاہیہ کالم اور ادبی خبر مضامین اور ہالی وڈ کے مشہور فنکاروں پر مضامین، جو ہفت روزہ نگاری : چترالی میں شائع ہوئے۔

○ ادبی کتابوں پر تبصرے۔

○ شاعروں ادیبوں کی شخصیت اور فن پر مضامین۔

○ مختلف شخصیات کے خاکے۔

——★ ★ ★ ★ ★——

فہرست

کہانیاں

ایں چہ حکایت باشد

کہانی کا دامن بڑا وسیع ہے۔ انسانی تہذیب کے آغاز سے اب تک کہانیوں نے مختلف صورتوں سے انسانی ذہن کو متاثر کیا ہے، پھر داستانوں، مختصر افسانوں، قصوں، فسانوں اور حکایتوں سے لے کر جدید افسانے تک اردو میں وسیع سرمایہ موجود ہے۔ اس طویل سفر میں زندگی کے انگنت رنگ، معاشرے کے متعدد پہلو، انسانی نفسیات کے مختلف زاویئے، فطرت و انسان اور انسان و انسان کے رابطوں کے رنگا رنگ نقوش، مسائل اور محرکات کی بسیار جہتیں اور حقیقت و تخیل کے کثیر نشانات پیش کئے جا چکے ہیں۔ اردو افسانے نے موضوعات اور اسالیب کے لحاظ سے زندگی کے نئے سے نئے رخوں اور اظہار کی نئی سے نئی سمتوں سے اپنا رشتہ قائم رکھا ہے، تصورات کی سچائیوں کی تلاش کی ہے، انسانی خوابوں کو پہچانا ہے، خارجی عوامل کو داخلی کیفیات سے منسلک کیا ہے اور ظاہر و باطن کی مغائرت و مماثلت کے روپ دکھائے ہیں۔

اردو افسانے نے جہاں عالمگیر انسانی تصورات اور مغرب کے افسانوی رجحانات سے اپنا تعلق قائم رکھا ہے، وہاں اپنے ملک کی بہتری کے نصب العین کو فراموش نہیں کیا اور مختلف خطوں کی مہک کے ساتھ ساتھ لمحہ حاضر کو بھی اہمیت دی ہے۔ اردو افسانہ نگاروں نے اصلاح، حقیقت پسندی، سماجی واقعیت اور تخیلیت کے کتنے ہی الوان و اعماق کو پیش نظر رکھتے ہوئے، انسانی اعمال کے نئے گوشوں پر روشنی ڈالی، جذبات و تاثرات کے نئے نقوش ابھارے اور کرداروں کی نئی جھلکیاں دکھائیں .... پھر ان افسانہ نگاروں نے خواہ تسلیم شدہ اجزائے افسانہ کے دروبست سے ابلاغ و ترسیل کا جادو جگایا ہو، کسی ایک جزو پر زیادہ توجہ دی ہو یا ابہام، علامت اور تجرید کے پردوں میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہو، اس سے بہر حال انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر قابل ذکر افسانہ نگار نے افسانے کی متشکلہ صورت میں اظہار کا کوئی نہ کوئی نیا پیرایہ نکالا ہے اور اپنے

مزاج و ماحول کے اعتبار سے ایک جداگانہ ذہنی رو کی ترجمانی کی ہے، چنانچہ احمد زین الدین کے افسانوں کا مجموعہ " دریچے میں بجی حیرانی " بھی ایسی ہی ایک ذہنی رو کو پیش کرتا ہے، جس کے ذریعے، ہم مخصوص تجربات، مشاہدات و حالات کے ساتھ اس زمین و فضا سے بھی روشناس ہوتے ہیں، جن سے ان کا افسانوی شعور متاثر ہوا ہے۔

احمد زین الدین کے ان افسانوں میں جو وصفی اعتبار سے الگ الگ نوعیتوں کے حامل ہیں وضعی اعتبار سے ایک قدرِ مشترک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے یہ افسانے مشاہدے، خیال یا تجربے کو انسانی، ہمدردی کے وسیع تصور سے، ہم آہنگ کرتے ہوئے جہاں بیان یا اظہار میں کسی نہ کسی تازہ کاری کے حامل ہیں، وہاں افسانویت یا افسانوی تاثر کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ وہ فن کی معنویت کے قائل ہیں اور معنویت کو اپنے فنی حدود میں خوش اسلوبی سے پیش کرنا جانتے ہیں۔ وہ افسانے کی روایت کے قائل ہیں، لیکن جدید افسانوی تجربات کو بھی سامنے رکھتے ہیں، مگر نہ ان کا روایت سے تعلق اپنے گرد و پیش کے رنگوں کے انجذاب میں مانع آتا ہے اور نہ ان کی جدت پسندی ادراکِ حقیقت کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ وہ ایک متوازن ذہن رکھتے ہیں، اسی لئے ان کے افسانوں میں مقررہ اجزا کی صورتگری نری تقلید نہیں کہی جاسکتی اور تاثر کی تلاش میں ان کی جدت خواہی انہیں لایعنیت کے راستے پر نہیں لے جاتی۔

اچھی بات یہ ہے کہ احمد زین الدین اپنے افسانوں میں دلچسپی کے عناصر برقرار رکھتے ہیں اور ان افسانوں کو قارئین کے لئے قابلِ قبول بنانے کے جتن سے غافل نہیں ہوتے۔ ہمارے گرد و پیش کہانیاں بکھری ہوئی ہیں، پھر کشمکشِ حیات، ہجرت اور زمین سے تعلق قائم رکھنے کی تمام کوششوں کے باوجود، پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک جانے کی جن کیفیات سے دوسروں کی طرح وہ دوچار ہوئے ہیں، وہ خود اپنے اندر وارداتوں کا خزانہ رکھتی ہیں، لیکن ہر قلمکار انہیں موثر انداز سے پیش کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ یہ امر موجبِ مسرت ہے کہ ان کیفیات کے انتخاب میں احمد زین الدین نے زندگی کے تناظر کو فراموش نہیں کیا ہے اور انہیں پیش کرتے ہوئے وہ محنت و ریاضت بھی صرف کی ہے، جو کسی فن پارے کو قابلِ قبول طور پر قاری تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے۔ ان کے افسانے نہ خلا کی پیداوار ہیں اور نہ جامِ خالی کی طرح خالی۔ اس کے برخلاف وہ حقیقت کے ایسے بیان یا تاثر سے معمور ہیں، جو ہمیں افراد اور ماحول کی واقفیت بخشتا ہے۔ ان کے افسانوں میں چھوٹی بڑی حقیقتوں کو پیش کرتے ہوئے وہ سمت بھی نظر آتی ہے، جو

زندگی کی ارتقائی قوتوں کی شناخت میں مدد دیتی ہے۔

احمد زین الدین نے اپنے بیشتر افسانوں میں کہانی یا قصہ پن کو مدِ نظر رکھا ہے۔ اس قصہ پن کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، لیکن جدت کے نام پر وہ کہانی کے خاتمے کے قائل نہیں۔ "تازہ ہوا کے شور میں" انہیں یہ یاد رہتا ہے کہ "قصہ کوئی پرانا نہیں ہوتا۔ وقت کی رنگ آمیزی اس میں جان ڈالتی رہتی ہے۔" وہ وقت کی رنگ آمیزی کے منکر نہیں، لیکن وہ اپنے آپ کو ازل سے وقت کی اس دھند بھری داستان کا، جو دلچسپ اور بہت تازہ ہے، ایک حصہ محسوس کرتے ہیں۔ اس حصے سے قطع نظر، اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں روشن خیالی و تعصب اور ترقی و رجعت کی عجیب صورتیں نظر آتی ہیں۔ زندگی کا عمل انقلاب بھی ہے، ردِ انقلاب بھی اور پھر انقلابِ تازہ کی تشکیل کے لئے نئے اجزا کی فراہمی بھی .... لیکن ان سب کے درمیان سچائی اور انصاف کے لئے انسان کی جدوجہد کا نقش باقی رہ جانے والا ہے، پھر صورتحال کی تلخی اور انسانی آزادی کے خوابوں کی تعبیر موجود کی نفی کے بعد بھی صبحِ فردا کے طلوع ہونے کی آرزومندی زائل نہیں ہوتی۔ احمد زین الدین کا مذکورۂ بالا افسانہ، جس میں نیا علامتی انداز بھی ملتا ہے، شبخون مارنے والوں کی خوشنودی کے لئے نہیں لکھا گیا، کیونکہ اس میں اشارۂ رجعت کے برخلاف زندگی کی بہتری کے لئے کاوشِ مسلسل کے عزم کی جھلک بھی ملتی ہے۔ احمد زین الدین کا یہ افسانہ آج کی نسل کے ذہنی انتشار کے بعض گوشوں کی ترجمانی کرتے ہوئے بھی اپنی ایمائی جہت کے اعتبار سے نہ صرف ان کے بلکہ بدلتے ہوئے حالات کے چند نمائندہ افسانوں میں گنا جا سکتا ہے۔

"دریچے میں بجی حیرانی" (جو زیرِ نظر افسانوں کے مجموعے کا نام بھی ہے) کسی بڑے موضوع کی کہانی نہیں، لیکن ذات کی دلگیری اور بخود پیچیدگی کو بڑے سلیقے سے پیش کرتی ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے، جو افسانے سے متعلق ابتدائی خیال آرائی سے لے کر اختتامیہ جملوں کی کرب انگیزی تک واضح نقوش ابھارتی ہے اور جزئیات کو فراموش نہ کرتے ہوئے خوش گمانی سے حیرانی تک کا سفر بسرعت، لیکن نپے تلے قدموں سے طے کرتی ہے۔ ابتدائی جملوں سے گمان ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کہانی کے بارے میں بے اسلوبی کا تصور پیش کر رہا ہے۔ یہ تصور چند لکھنے والوں نے بعض بیرونی تحریکات سے لے تو لیا، لیکن ہماری سرزمین کی کیفیات اور تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کر سکے۔ احمد زین الدین نے ایسا نہیں کیا ہے اور نہ ان کے ابتدائی جملے "نیچرل ازم" کے "زندگی کی قاش" کے تصور سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ "ردِ افسانہ" یا "مخالفِ کہانی" کی رو کو پیش کرتے ہیں۔

وہ تو سوکھی مٹی کے استعارے سے یہ بتا رہے ہیں کہ "بارش سے پہلے کل تک کسی کو کیا خبر تھی کہ سوکھی مٹی بھی بولنے لگے گی" اور یہی استعارہ جب اس طرح منقلب ہوتا ہے کہ "سوکھی مٹی اگر بولنا چاہے بھی تو ہمیشہ نہیں بول سکتی" تو ایک تراشیدہ افسانوی روئداد ہمارے سامنے آجاتی ہے اور سوکھی مٹی بولے یا نہ بولے، لیکن کردار اور کہانی کے حوالے سے استعارہ بولنے لگتا ہے۔

اس مجموعے میں احمد زین الدین کے کئی افسانے سابق مشرقی پاکستان سے منسلک ہیں۔ وہاں کی روایات میں زمین اور انسان سے تعلق کی جو گہری چھاپ تھی، وہ اس سے ضرور متاثر ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں فطرت کے رنگوں کے تناظر میں زندگی کی نیرنگیوں کے جو جلوے نظر آتے ہیں، اردو افسانے کی عام روایات ان سے بیگانہ رہی ہیں، پھر جہاں کہیں بھی اس سرزمین کے اثر سے جرأتِ اظہار کے تیور آئے ہیں، انہیں بھی ایک نوع تازہ کاری میں شمار کیا جاسکتا ہے ایک جانب زندگی کے مصائب نمایاں تھے تو دوسری جانب جذبات کی دھوپ چھاؤں اور فطرت کی موسیقی نے اس سرزمین کو صحیح معنوں میں جادو کی سرزمین بنا دیا تھا۔ اس لحاظ سے بھی احمد زین الدین کے یہ افسانے قابل مطالعہ ہیں کہ جہاں بعض افسانہ نگار درآمد کردہ تحریکات سے زیادہ ان کے لیبلوں سے اپنی شناخت کرانے میں مصروف ہیں، وہاں احمد زین الدین کی سرزمین بنگال سے تعلق رکھنے والی کہانیاں اپنی عقبی زمین کی نئی اور متحرک تصویروں سے خود اپنی شناخت بن جاتی ہیں۔

اس مجموعے کے افسانوں میں "ادھورے خواب کا غم" خوابوں کے سلسلے کو پیش کرنے کی کہانی ہے، لیکن کردار بے نام اور بے شناخت ہوتے ہوئے بھی، اس کا تانا بانا سماجی حقیقتوں سے بنا گیا ہے اور سماجی انصاف کی خواہش اس کی تہوں میں جاگزیں ہے، مگر خارجی حالات کا جبر انسان کو مسخ اور منقلب کرتا رہتا ہے، البتہ صورتحال اور خوابوں کے تصادم میں ادھورے رہ جانے والے خواب بھی آرزوئے تشکیل کے ساتھ باقی رہ جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس افسانے کو تفسیر کنندہ کہا جاسکتا ہے۔ "اندھیرے میں سبز کونپل" میں داخلی احساسات کو علامتوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے، لیکن جہاں خارجی واقعات کا اتصال ملتا ہے، وہاں یہ افسانہ محض ایک فرد کی ذہنی روئداد نہیں رہتا۔ اس میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ "میں کیسے اپنی ذات کے خول میں بند رہوں۔ میں علامتوں کو اجتماعیت کی وہ زبان کہاں سے عطا کروں جو سب کے دکھوں کو سمیٹ سکیں۔" یہ اشارہ علامت پسندوں کے لئے نشان راہ بن سکتا ہے۔ "پالا" تنگدستی اور فلاکت کا افسانہ ہے،

لیکن اپنے بیان میں "پالا" موسم اور کیفیتِ حال دونوں سے وابستہ ہے۔ "وہ شجر تھا موسم درد کا" کا صرف عنوان ہی شاعرانہ نہیں، اس کے بیان کی شعریت زندگی کے حزن کو نمایاں کرتی ہے۔ یہ افسانہ پاکستان کے شمالی علاقے کا افسانہ سہی لیکن اس میں سابق مشرقی پاکستان سے حاصل کردہ نغمہ درد کی محبت اور آج کے شہروں کی عطا کردہ مغائرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ "تیرگی کے دھاگے میں دھان، پاٹ، کشتی، گھاٹ اور بھٹیالی کے بولوں پر منافع خور بیوپاری اور بازار کے بھاؤ کی حکمرانی ہے اور زندگی کو بہتر بنانے کی خواہش کارِ زیاں بن جاتی ہے۔ "درد کی چاندنی" محبت اور جذباتی محبت کی کہانی سہی، لیکن اس میں جذبات کو شاعرانہ حسن سے پیش کیا گیا ہے۔ "مجذوب کی بڑ" ایک شکستہ شخصیت کا افسانہ ہے، لیکن واقعۂ شکستِ شخصیت کے ذکر سے پہلے اجزائے خیال، ڈھاکا اسٹیڈیم، آس پاس کی دکانوں اور حالات و افراد کا بیان معنی سے خالی نہیں۔ "زندگی کے ساز پر" منٹو اور موپاساں کے بعض افسانوں کے موضوعِ عصمت فروشی پر لکھی ہوئی کہانی ہے، لیکن مشرقی پاکستان کے ماحول اور کردار نے اسے الگ جاذبیت بخش دی ہے۔ "نورا" اس کے برخلاف ڈھاکے کی معاشی ابتری کے پس منظر میں، جو ایک حد تک کسی بھی بڑے شہر کی معاشی ابتری کا ترجمان ہو سکتا ہے، ایک کردار کے اخلاقی زوال اور دوسرے کی مات کر دینے والی حیرت کے ایسے رخ کا بیان ہے کہ واقعات کی سنگینی نمایاں ہو جاتی ہے۔ "ٹیکا سو کے پھول" بھی سابق مشرقی پاکستان کے پس منظر میں ایک کردار کی بدی کا افسانہ ہے، جس کے تحت افسانہ نگار جنگل میں ٹیکا سو کے پھولوں کو خون سے زیادہ سرخ محسوس کرتا ہے۔ "زرد موسم کی صلیب" پرندے کی صورت میں ایک آزاد روح کا افسانہ ہے، جو ہجرت، خیمہ بستی اور بارود کے عذابوں سے گذرتے ہوئے جب "آدم زادوں کے اعمال سے خود ان کی دنیا ان کے لئے تنگ ہو جاتی ہے"، نئی فضاؤں میں اپنا راستہ آپ بناتا ہے۔ "درد کی بازگشت" وادی کشمیر کے حریت پسندوں کی المناک کہانی ہے، جس میں دردناک واقعات کے علاوہ انسانی حقوق کے دعوے اور انسانی حقوق کی پامالی کے تضاد سے ایک غمناک تاثر ابھرتا ہے۔ "آرزوؤں کا ایک ویرانہ" بنگالے کے سیلاب میں ڈھاکا آئے ہوئے ایک فرد کی بے بسی کا افسانہ ہے، جس میں داخلی تلازمات کے بجائے خارجی واقعات سے کام لیا گیا ہے۔ "ڈھلتی دھوپ کا نوحہ" یوں تو ڈھلتی عمر کا نوحہ ہے لیکن اس کی نفسیاتی اشاریت (جس میں جنسی اشاریت بھی شامل ہے) اور بیان کی جاذبیت اسے ایک پارۂ لطیف بنا دیتی ہے۔

احمد زین الدین کے افسانوں میں کرداروں اور ماحول کا مطالعہ، اشاریت اور اجزا کی مطابقت، یہاں تک کہ خود عنوانات بھی ایک سوچنے والے ذہن کا پتا دیتے ہیں، ایک ایسا ذہن جو کہانی لکھنے میں فنی ریاضت کو فراموش نہیں کرتا۔ دراصل ہم شکستِ یقین کے جس دور میں سانس لے رہے ہیں، اس میں زندگی کے دھارے کا رخ بدلنے والے انقلابی کردار تقریباً معدوم ہوگئے ہیں اور انفعالی کیفیات کی گرفت بڑھتی جارہی ہے۔ جب منفی اور سلبی، انجام شدہ کی حیثیت رکھتے ہوں، پیشروی، مزاحمت اور استحکام ثبات مشکل سے مشکل تر بنتے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود احمد زین الدین کے افسانوں میں انسانیت کے درد کے جو پیرائے ملتے اور خوابوں کی آمیزش کے جو سلسلے پائے جاتے ہیں، وہ انہیں انسان دوستی کے تصورات کی وسیع میراث سے منسلک رکھتے ہیں۔ وہ مجہول الحالی کے سمندر میں غوطے نہیں لگاتے اور نہ عناصرِ انتشار کے سیلاب میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ فرد کی پہچان، وطن سے محبت اور انسانی اقدار کے جویا نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانے اس لحاظ سے ترقی خواہی کا نشان ہیں۔

احمد زین الدین کے افسانوں کی فنی بنت اور احساس انگیز اظہار (جو احمد علی، احمد ندیم قاسمی اور میرزا ادیب کی یاد دلاتا ہے، لیکن ان سے مختلف بھی ہے) لائقِ توجہ ہے۔ اس وقت جب بعض افسانہ نگار تعلقاتِ عامہ کے بل بوتے پر شہرت حاصل کرتے، اپنی نارسیدہ کاوشوں کو بڑے اہتمام سے آگے بڑھاتے اور ادبی تاریخ میں ان کا نام رہے یا نہ رہے، اعلیٰ رابطوں کے ذریعے وسیع پیمانے پر اپنے آپ کو منواتے نظر آتے ہیں، احمد زین الدین کی یہ ریاضتِ گوشہ نشینی مبارکباد کی مستحق ہے۔ انہوں نے ادب کو انسانی تہذیب کا ایک حصہ جانا ہے اور انسانی تہذیب کا ارتقاء علمی خزانوں کے فروغ، جمالیاتی صورتوں کی پیشروی اور معاشرتی ترقی سے وابستہ ہے۔ احمد زین الدین کے زیرِ نظر افسانے اک عمر کے تجربے اور مشاہدے کی کشید ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے سہل الحصول وسیلوں اور وجہِ شہرت کرتبوں سے دور رہ کر اپنے فن کی نشوونما کی ہے۔ امید ہے کہ اہلِ نظر میں افسانوں کے اس مجموعے کی اس کے حق کے مطابق پذیرائی ہوگی۔

حنیف فوق

(پروفیسر ڈاکٹر حنیف فوق)

سکریٹری و چیف ایڈیٹر، اردو ڈکشنری بورڈ، کراچی

دھوپ اور چھاؤں کا مسافر — احمد زین الدین

اردو کی نسبتہً جدید اصنافِ ادب میں افسانہ اپنی ترقی کے اعتبار سے ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی ساری نشوونما کم و بیش بیسویں صدی کے دوش بدوش ہوئی ہے، لیکن اس ایک صدی میں کمیت و کیفیت کے لحاظ سے اس میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔ ہر دور کا ایک غالب رجحان اسے کسی نقطۂ نظر، تکنیک یا اسلوب سے متصف کردیتا ہے۔ اردو میں بھی رومانیت، حقیقت نگاری، ترقی پسندی، علامت نگاری تجریدیت وغیرہ اپنے اپنے ادوار کی نمائندگی کرتے ہیں، تاہم حقیقت یہ ہے کہ کوئی افسانہ نگار، جس کے یہاں رجحان سازی کا عنصر فطری طور پر موجود ہو، کسی منشور یا تحریک پر اتنا انحصار نہیں کرتا، جتنا کہ خود اپنے انفرادی اسلوب اور ذاتی سعی و کاوش پر۔ رجحان یا تحریک کسی عہد کی عکاسی یا سمت نمائی کا فریضہ انجام دے سکتی ہے، لیکن ایک آرٹ فارم کی حیثیت سے کسی بھی تخلیق کی پہچان اور قدر و قیمت لکھنے والے کی انفرادی صلاحیت پر منحصر ہوتی ہے۔

احمد زین الدین اردو کے جدید افسانہ نگاروں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ گزشتہ کئی برسوں سے پابندی کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ برِ صغیر پاک و ہند کے موقر ادبی رسالوں میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہے ہیں اور افسانوں کے سنجیدہ ناقدین اور قارئین ان کی افسانہ نگاری کو قابلِ توجہ سمجھتے رہے ہیں، تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ جب تک کوئی تخلیقی کاوش کتابی صورت میں نہ آجائے، اس کی مجموعی صفات کا تعین ادھورا ہی رہتا ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ احمد زین الدین کے افسانے "دریچے میں بجی حیرانی" کے نام سے منظرِ عام پر آرہے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں سارے کے سارے افسانے مختصری ہیں۔ اس ظاہری لیکن بنیادی صورتحال نے سب سے پہلے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ہر تخلیقی فن کی ایک گنجائشِ اظہار

(SPAN OF EXPRESSION) ہوتی ہے اور تخلیقی فنکار اسی زاویے سے پہچانا جاتا ہے کہ اس نے کس حد تک اس کے فطری تقاضوں کو برقرار رکھا ہے۔ جب کسی فن پارے کے بارے میں یہ رائے دی جاتی ہے کہ اس کو پڑھ کر تشنگی کا احساس ہوتا ہے یا اسے زبردستی کھینچا یا بڑھایا گیا ہے۔ DRAG کیا گیا ہے تو بالواسطہ فنکار کے اسی نقص کی جانب اشارہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع کی گنجائش اظہار سے یا تو کم رہ گیا یا تجاوز کر گیا۔ اس نقطۂ نظر سے مجھے احمد زین الدین کے یہاں ایک تخلیقی چابکدستی اور شعورِ اظہار کا تناسب محسوس ہوتا ہے۔ یہ یقیناً ان کا اہم تخلیقی وصف ہے، جس کے آئینے میں ان کے افسانوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

احمد زین الدین ایک سنجیدہ، حساس، مخلص اور دردمند انسان ہیں۔ وہ ادب اور زندگی کے ناگزیر رشتوں کو نہ صرف تسلیم کرتے ہیں، بلکہ اپنے سماجی رویوں کو حقائق سے قریب تر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح زندگی کے حسن اور جمالیات کے ساتھ ساتھ انھیں معاشرے کے ان مسائل سے بھی آگاہی حاصل ہوجاتی ہے، جن کی بنیاد اکثر معاشی ناہمواری، طبقاتی کشمکش، سماجی ناانصافی، بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور جبر و تشدد کے پھیلتے ہوئے رجحانات سے تعلق رکھتی ہے۔ احمد زین الدین فرد اور سماج کے دوہرے رشتے کو سمجھتے اور ان میں سے ہر ایک کو اس کے فطری تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ آج کا کوئی باشعور انسان سیاسی طور پر غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ سیاست کے بعض طریقے اور سیاسی نظاموں کے بعض فیصلے مقامی اور بین الاقوامی طور پر براہِ راست فرد اور سماج پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ احمد زین الدین کے یہاں اس فکر کی بھی ایک جہت ملتی ہے، لیکن اپنے مزاج کے مطابق اسے بھی وہ دھیمے رنگوں اور بلاواسطہ جذبات و محسوسات کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں، جیسے ان کا ایک افسانہ ہے "تازہ ہوا کے شور میں"۔

اس افسانے کا پس منظر انقلابِ روس سمیت ایسے تمام انقلابات ہیں، جو انسان کی فلاح و بہبود کے لئے برپا کئے گئے۔ ان کی ایک نظریاتی اساس رہی، جسے نہ صرف ان کے مقامی اذہان بلکہ عالمی اور بین الاقوامی سطح پر بھی انسانوں کی بڑی تعداد مانتی رہی، لیکن ایک وقت آیا جب اکابر نظریہ سازوں کے مجسموں کی گردنوں میں رسے ڈال کر انھیں زمیں بوس کردیا گیا۔ یہ واقعات تو اخبارات میں بھی شائع ہوئے، لیکن احمد زین الدین کے ٹریٹمنٹ اور افسانے کے آخر میں سوال اٹھانے کی تخلیقی جرأت نے ان کے افسانے کو اثرانگیز بنادیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ موضوع کے اعتبار سے احمد زین الدین کے سوا کسی اور نے اس انداز سے نہیں لکھا۔

اس افسانے میں ماں کا کردار بنیادی ہے ۔ نہ معلوم کیوں مجھے یہ افسانہ پڑھتے ہوئے گورکی کی "ماں" یاد آتی رہی ۔ وہ تو ایک ضخیم اور عظیم ناول ہے، لیکن یوں لگتا ہے جیسے اس کے بعد بھی تغیرِ وقت کو ایک کہانی کہنا تھی اور احمد زین الدین کی گرفت میں یہ کہانی آگئی ۔

احمد زین الدین کی اس کتاب میں افسانوں کی تعداد زیادہ نہیں، لیکن جتنے افسانے ہیں ان میں موضوعات اور انسانی تجربات کا تنوع ملتا ہے ۔ "دریچے میں بجی حیرانی" ایک ایسا تجربہ ہے، جو اس معاشرے کے لئے نیا نہیں ۔ عیاں اور مخفی جذبوں اور خلوص و ہوس کے مابین کیسے تفریق کی جاسکتی ہے، انھیں کیسے پہچانا جاسکتا ہے؟ یہ مسئلہ ہر دور میں ہر سوچنے اور محسوس کرنے والے انسان کے ذہن کو متاثر کرتا رہا ہے ۔ احمد زین الدین نے اس نازک اور گہرے انسانی تجربے پر یہ ایک خوبصورت کہانی لکھی ہے ۔

"زرد موسم کی صلیب" مختصر تاثراتی افسانہ ہے ۔ سائبیریا سے ترکِ سکونت کرنے والے ایک پرندے کے حوالے سے ہجرت، انسانی ذات کے تحفظ اور امنِ عالم کو درپیش خطروں اور اندیشوں کی فضا کو اس کہانی میں ابھارا گیا ہے ۔ احمد زین الدین بات کو پھیلا کر نہیں بلکہ سمیٹ کر لکھتے ہیں ۔ یہ ان کی تکنیک تو ہے ہی، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اپنی ذاتی سطح پر کہانی لکھنے کا ایک شعور بھی رکھتے ہیں، جو انھیں افراط و تفریط کا شکار ہونے سے محفوظ رکھتا ہے اور یہ ایک بنیادی عنصر ان کی کہانیوں کی کامیابی کا حاصل نظر آتا ہے ۔

ہر انسان جو زمانے کی کیفیتِ گزراں کو سمجھتا ہے، ماضی، حال اور مستقبل کے رشتوں کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے ۔ اپنی ذاتی زندگی، ذاتی ماحول اور پھر اس سے ماورا پوری انسانیت کے لئے کوئی گلشنِ ناآفریدہ ضرور اپنے ذہن میں رکھتا ہے ۔ اسے کبھی آدرش اور کبھی نصب العین سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن اس کا ایک عام فہم لیکن نہایت گہری معنویت رکھنے والا ایک اور طلسمی لفظ بھی ہے جسے "خواب" کہا جاتا ہے ۔ خوابوں کی اہمیت انسانی زندگی میں بہت ہے ۔ احمد زین الدین کی کہانیوں میں ایسے خوابوں کے رنگ اور ان کی جھلکیاں بار بار نظر آتی ہیں، جو انسانی اقدار کی نسبت سے بہت اہمیت رکھتی ہیں ۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ احمد زین الدین ایک آدرش وادی اور نظریاتی ادیب ہیں اور ان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں کو کہیں نعرے بازی یا سستی اور سطحی نظریاتی کتھا نہیں بننے دیا ۔ وہ سلیقے سے انسانی سچویشن کو اس کے فطری تناظر میں رکھتے ہیں اور پھر تہ در تہ محسوسات کے دھیرے دھیرے سفر کرنے والے

زاویوں کو ایک شگفتہ اور شائستہ زبان میں ابھارتے ہیں ۔ اس کی ایک اچھی مثال " ادھورے خواب کا غم " ہے ۔ اس میں کئی کردار ہیں، جن کی گفتگو ہی سے ان کا تعارف ہو جاتا ہے اور پھر ہر فرد ایک پورے طبقے کی علامت بن کر ذہن پر چھا جاتا ہے ۔

ایک کردار کہتا ہے:

" خوابوں کی تعبیر فرسٹریشن ہے، مگر خواب دیکھنا میری فطرت ہے ۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، میری آنکھیں خوابوں کے ریشم بنتی ہیں ۔ آنکھ لگ جائے تو خواب پچھتاوے کا ہیولا بن کر ڈراتے ہیں اور کھلی آنکھوں سے دیکھے ہوئے خواب پیار کے موسم کے مانند لگتے ہیں ۔ ذہن کے جنگل میں خوابوں کے خوش نما منظر لہلہاتے ہیں ۔ میں اس میں کھو جانا چاہتا ہوں ۔ "

اسی طرح ہر کردار اپنے اپنے حوالے سے گفتگو کرتا ہے، لیکن اچانک یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بھونچال آگیا ہو، خواب بکھرنے اور ریزہ ریزہ ہونے لگے ہوں، سارے خواب معدوم ہونے لگے ہوں، لیکن آخری دو سطروں میں یقین کی ایک کرن ابھرتی ضروری ہے، کیونکہ خواب بھی انسان کے اندر کی آواز ہیں اور جب تک انسان زندہ ہے، نہ اندر کی آواز ختم ہوگی اور نہ خواب دیکھنے کا سلسلہ منقطع ہوگا۔

" ڈھلتی دھوپ کا نوحہ " ہمارے موجودہ معاشرے کا ایک اہم موضوع ہے ۔ اکثر لڑکیاں مجبور آور کنگ گرل بن جاتی ہیں ۔ شروع میں یہ شوق، وقت گزاری کا مشغلہ یا ضرورت ہو سکتی ہے، لیکن آگے چل کر جب یہ ایک جبری مشقت کا عذاب محسوس ہونے لگے اور لڑکی پر ماہ و سال کے گزر جانے اور اپنی دلکشی اور جاذبیت سے بتدریج محروم ہونے کا احساس طاری ہونے لگے، تو اس سے بڑے نفسیاتی مسائل پیدا ہوتے ہیں ۔ احمد زین الدین نے اس کہانی کو بھی سلیقے سے لکھا ہے ۔ کہانی ایک نوعیت کی شعور کی رو اور خیال کے بہاؤ سے تعلق رکھتی ہے ۔ یہ کہانی بھی احمد زین الدین کی دوسری کہانیوں کی طرح بلند آہنگ (LOUD) نہیں ہے، بلکہ محسوسات کی آہستہ روی قاری کے ذہن کو اپنے ساتھ ساتھ دور تک لے جاتی ہے اور اسے سارے واقعات ایک اداس اور حزنیہ سرگوشی کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ۔

" اندھیرے میں سبز کونپل " ایک ایسی کہانی ہے، جس میں خود کہانی کار کا سیلف (SELF) اجاگر ہوتا نظر آتا ہے ۔ ہر فنکار کی ایک گھریلو زندگی اور معاشی ذمے داری بھی ہوتی

ہے اور ساتھ ہی ساتھ تخلیق کی امنگ اپنا اظہار بھی چاہتی ہے ۔ یہ کشمکش کم و بیش ہر تخلیقی وجود کا حصہ ہوتی ہے ۔ ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ نے لکھا ہے کہ ہر فنکار میں دو وجود ہوتے ہیں: ایک جو زندگی کی آزمائش و ابتلا سے گزرتا ہے اور دوسرا جو تخلیق کرتا ہے ۔

(One who suffers and other who creates)

احمد زین الدین کے اس افسانے کا تخلیق کار کردار کہتا ہے:

" علامتوں کی جستجو میں، نئے سفر کی آرزو میں پرانے گھر سے میں نے اپنا ناتا توڑنا چاہا ۔ "

" میں کیسے اپنی ذات کے خول میں بند رہوں ۔ میں علامتوں کو اجتماعیت کی وہ زبان کہاں سے عطا کروں، جو سب کے دکھ کو سمیٹ سکیں ۔ "

یہی وہ کشمکش اور یہی وہ آدرش ہے، جو احمد زین الدین کی (بحیثیتِ افسانہ نگار) تخلیقی فکر کا محور ہے ۔ ادب کے اچھے خاصے رقبے پر ایک مدت تک انفرادیت پسندی اور غیر نظریاتی، غیر اجتماعی طرزِ احساس کو مسلط کرنے کی کوشش کی گئی ۔ یہ فضا اب بھی کہیں کہیں ہے ، لیکن احمد زین الدین اس گروہ میں شامل نہیں ہیں ۔ وہ زندگی کا مثبت اور صحتمند تصور رکھتے ہیں ۔ انھیں انسانی مسائل کی سنگینی کا احساس ہے ۔ انھوں نے چند منتخب یا پسندیدہ موضوعات کو اپنی کہانیوں میں بار بار نہیں دہرایا ہے ۔ وہ انسانی قدروں اور فردا کے روشن امکانات پر یقین رکھتے ہیں ۔ یہی یقین ان کے افسانوں کا سب سے بڑا وصف ہے اور اسی یقین نے مجھے ان کے افسانوں پر اپنے کچھ خیالات پیش کرنے کا جواز فراہم کیا ہے ۔ مجھے امید ہے کہ احمد زین الدین کے افسانوں کا یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا ۔

سحر انصاری

پروفیسر ، صدر

شعبہ اردو جامعہ کراچی

(پروفیسر سحر انصاری)

کچھ اس کتاب کے متعلّق

اس مجموعہ میں احمد زین الدین کے کل ۱۶ افسانے شامل ہیں۔ ان میں جہاں کچھ افسانے بیانیہ طرزِ تحریر کا نمونہ ہیں، وہاں پانچ افسانے تجریدی ہیں۔

تجریدی افسانوں کی دھندلی دھندلی فضا میں، ہم "ادھورے خوابوں"، "ڈھلتی دھوپ"، "تاریکی"، "زرد موسم" اور "تازہ ہوا" کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ان میں اگر کہیں افسردگی اور حرماں نصیبی ہے تو کہیں صبح فردا کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ مصنف نے ہر مقام پر عمدہ فضا بندی کی ہے۔

"ایک لڑکی خود کو دریا برد کر دیتی ہے تاکہ اس کی لاش اس کنارے پہنچ جائے، جو اس کے اپنوں کا ہے اور اس طرح اس کا مردہ جسم انھیں غیروں کے ظلم و ستم کی کہانیاں سنا جائے۔" (درد کی بازگشت)۔

"فتح محمد کی لڑکی کی شادی پہلے کریم سے ہوتی ہے اور جب وہ مارا جاتا ہے تو اس کی شادی لطفو سے کر دی جاتی ہے اور وہ بھی رہزنوں سے مقابلہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔" (ٹیکاسو کے پھول)۔

"زندگی کے ساز پر" ایک شریف النفس نوجوان کی داستان ہے جو ایک لڑکی کو، جو باپ کا علاج کرانے کے لئے جسم فروشی پر مجبور ہو جاتی ہے، بغیر چھوئے دس روپے دے دیتا ہے۔ لڑکے کا یہ "Gesture" لڑکی کے لئے بیحد حیرت انگیز ہے، کیونکہ اب تو اس دنیا میں اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کا دستور چل نکلا ہے۔

"دریچے میں بجی حیرانی" ایک غلط فہمی پر مبنی ہے کہ ایک مضمون نگار خاتون نے جب کسی محفل میں اپنا مضمون پڑھا، تو ایک خاتون نے انھیں اپنے لڑکے کے لئے Propose کر دیا۔ تب انھیں یہ سن کر سخت حیرت ہوئی کہ نہ صرف یہ کہ لڑکی شادی شدہ تھی، بلکہ دو بچوں

کی ماں بھی تھی۔

"نورا" میں نورا کی ماں اس کی کفالت کے لئے اپنی عزت بیچتی ہے۔ تب وہ کوشش کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے اور ماں کی طرف سے بے تعلق سا ہو جاتا ہے۔

لیکن "تیرگی کے دھاگے" خاصا مختلف سا افسانہ ہے۔ یہ بنگلا دیش کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور جوٹ کے کاشتکاروں کی زندگی اور ان کے معاشی مسائل کو کمال حسن و خوبی سے پیش کرتا ہے۔

گاؤں کا سارا جوٹ شہر کا ایک بیوپاری سستے داموں میں خرید کر لے جاتا ہے اور شہر لے جا کر اس سے خاصا منافع کماتا ہے۔

"ملن بیوپاری آیا تھا۔ وہ گاؤں کے تمام لوگوں سے پاٹ اکٹھا کرنے کو کہہ گیا ہے۔" (تیرگی کے دھاگے)، تب گاؤں کا ایک نوجوان اس Middleman Profit کو ختم کرنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ وہ گاؤں کے بیشتر کاشتکاروں کا جوٹ لے کر شہر جاتا ہے اور اسے اچھی قیمت پر بیچ آتا ہے۔ "گاؤں والوں کے ساتھ ساتھ اس کی حالت بھی اچھی ہو گئی تھی۔" .... پر یہ کہ مصنف ہمیں بتاتا ہے کہ کاشتکاروں کی اس سوجھ بوجھ کے باوجود آسمانی بلاؤں سے انھیں مفر نہیں۔ چنانچہ ایک سال سارا جوٹ سیلاب کی نذر ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرے سال فصل اتنی اچھی ہوئی کہ جوٹ کا بھاؤ گر گیا اور کاشتکاروں کو زبردست گھاٹا سہنا پڑا۔

"کل رقم اسے اصل سے بھی کم ملی۔ روپیہ لیتے ہوئے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا لہو نچوڑ لیا ہو۔" (تیرگی کے دھاگے)

احمد زین الدین کے یہاں جو زندگی سے گہری وابستگی ہے، وہ قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتی ہے .... خوشیاں اور غم .... غم اور خوشیاں ....!

انھیں زبان پر قدرت حاصل ہے۔ میں ان کے روشن مستقبل کے لئے دست بدعا ہوں۔

احمد یوسف
۲۲ / اگست ۹۶ء

(احمد یوسف)

وائس چیرمین، بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ

دُکھوں کے تسلسل کی کہانیاں

اردو افسانہ اپنے سو سالہ سفر کے دوران مختلف مراحل سے گزرا ہے۔ اس نے متنوع موضوعات اور بوقلموں تکنیکوں کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ جنوبی ایشیا کے مختلف علاقوں کے مسائل اور کلچر کو بھی پیش کیا ہے۔ ان علاقوں میں پنجاب، اتر پردیش، بہار اور حیدر آباد دکن کے علاقوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بنگال بھی جنوبی ایشیا کا اہم خطہ ہے۔ فورٹ ولیم کالج اور مرشد آباد کے حوالے سے اردو ادب میں بھی بنگال کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے، لیکن "پریم پجاری" کی کہانیوں سے قطع نظر اردو افسانے میں بنگال کا ظہور صحیح معنوں میں پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ہی ہوا۔ مشرقی پاکستان کے پچیس سالہ دور میں جن افسانہ نگاروں نے اس خطے میں اردو افسانے کی آبیاری کی ان میں بانو اختر شہود، شہزاد اختر، غلام محمد، ام عمارہ، احمد سعدی، زین العابدین اور احمد زین الدین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

احمد زین الدین نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز چونکہ مشرقی پاکستان سے کیا اس لیے سنہری ریشے کے اس دیس کے سماجی و معاشی مسائل ان کے افسانوں کے موضوعات بنے۔ اس وقت تک ہجرت کا کرب ان کے ہاں نمایاں نہیں ہوا تھا، لیکن دوسری ہجرت کے بعد ان کے ہاں ہجرت کے مسائل و مصائب نمایاں ہونے لگے، پھر ان کی توجہ المیہ کراچی کی طرف مبذول ہو گئی۔ اس طرح احمد زین الدین کے ہاں مشرقی پاکستان سے کراچی تک دکھوں کا ایک تسلسل نظر آتا ہے۔

انھوں نے جب لکھنا شروع کیا، اس وقت تک بیانیہ افسانہ ہی سکہ رائج الوقت تھا۔ اس لیے ان کے ہاں بیانیہ طرز کے افسانے ہی نظر آتے ہیں، لیکن بعد کے دنوں میں انھوں نے کچھ نیم علامتی اور نیم استعاراتی طرز کے افسانے بھی تصنیف کیے۔ اہم بات یہ ہے کہ اسلوب بیانیہ ہو یا استعاراتی، احمد زین الدین کہانی بننے اور افسانہ لکھنے کا فن بہر حال جانتے ہیں۔ "نورا" بنگال کا

ایک نوجوان ٹھیلے والا ہے، جو اپنی ماں سے شدید محبت کرتا ہے، لیکن اسی ماں کی وجہ سے اسے معاشرے میں طنزو تشنیع کا نشانہ بھی بننا پڑتا ہے۔ماں بھی بیٹے کو چاہتی ہے، مگر وہ بیٹے کو معاشرے کی طرف سے لگائے جانے والے زخموں سے محفوظ نہیں رکھ سکتی کہ وہ اپنی ضرورتوں کے ہاتھوں مجبور ہے۔

یہ اس بنگال کی کہانی ہے، جو ہم سے جدا ہو چکا ہے۔جدا ہونے کے بعد وہاں کیا ہوا اس کی جھلک "درد کی فصیلیں" میں پیش کی گئی ہے۔سیاست اور نفرت کی بے رحم آندھیاں ایک ہی زمین پر بسنے والوں کو کیسے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیتی ہیں، ارمانوں سے تعمیر کئے گئے آشیانے کے تنکے کس طرح بکھرتے ہیں، اس کا دلگداز احوال اس کہانی میں نظر آتا ہے۔

بنگال ہی کی طرح کراچی سے سرحد اور شمالی علاقہ جات تک غم کی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں پہلے ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان وجود میں آیا، پھر پاکستان تقسیم ہوا اور بنگلہ دیش وجود میں آگیا۔ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش برِ صغیر کے تینوں ممالک لہو میں تر اور نڈھال ہونے کے باوجود، بہر حال آزاد ہیں، لیکن کشمیر جنت نظیر وہ بدنصیب خطہ ہے، جو پچاس سال بعد بھی اداس ہی ہے۔ کشمیری اپنے حقِ خود ارادیت کے حصول کے لیے مستقل قربانیاں دے رہے ہیں۔ قربانی اور جدوجہد کی راہ میں خواتین بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ ہیں۔ "درد کی بازگشت" میں کشمیریوں کی جدوجہد کی بہت پر اثر عکاسی کی گئی ہے۔

غرض برصغیر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہر طرف درد کی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔فنکاروں، دانش وروں اور عوام نے ترقی و خوشحالی کے جو خواب دیکھے تھے وہ شکستہ سے شکستہ تر ہوتے جا رہے ہیں۔اسی لیے "ادھورے خواب کا غم" کا ایک کردار کہتا ہے .....

....

"بچپن سے لے کر آج تک میں بھی خواب ہی دیکھ رہا ہوں۔ میرے دل میں بار ہا یہ خواہش خواب کی طرح ابھری کہ میں ساری دنیا کے دکھ سمیٹ لوں اور اپنے اطراف میں پھیلے ہوئے انتشار کو امن کی جھولی میں ڈال لوں مگر یہ بھی خواب ہے۔ساری عمر قلم سے رفاقت کرنے کے بعد بھی مجھے کیا ملا؟ خواب اور صرف خوب۔ معاشرے اور گھر والوں کی نظر میں میری کیا وقعت ہے۔شاید میرے بچے اپنے خوش حال ساتھیوں کی صحبت میں بیٹھ کر مجھ سے نفرت کرتے ہوں یا مجھے ڈس اون کرتے ہوں۔ میرے اپنے ساتھی زندگی کی دوڑ میں بہت آگے نکل گئے۔ ان

کے پاس جدید دنیا کی ساری آسائشیں مہیا ہیں اور میں آج بھی پرانے ہولڈر سے نئے خواب لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ معاشرے میں میرے لیے صرف خواب رہ گئے ہیں جن کے سہارے، ہم سب جی رہے ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ مجھے خوابوں سے محبت سی ہو گئی ہے کھلی آنکھوں سے دیکھے ہوئے خواب اچھے لگتے ہیں۔ اگرچہ یہ نہ ہوتے تو ہم پتھر کے ہوگئے ہوتے مگر آخر کب تک، ہم خوابوں کے سہارے زندہ رہیں گے ؟"

خوابوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کے باوجود خواب دیکھنے کا عمل جاری ہے اور جاری رہے گا۔ احمد زین الدین نے بھی یہی کیا ہے۔ کہانی کسی خطے اور کسی طبقے سے متعلق ہو ان کا رویہ ہمیشہ دردمندانہ اور انسان دوستی کا رہا ہے۔

جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں افسانہ نگار نے بڑی حد تک "شاعرانہ زبان" کی پیروی کی ہے جبکہ ان کے ہم عصر دوسرے افسانہ نگاروں نے نثر کو روایتی آرائشوں سے الگ کر کے اسے خالص نثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ احمد زین الدین نے افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۶۰ء کی دہائی کی ابتدا میں کیا تھا۔ اس طرح ان کی افسانہ نگاری کی عمر ساڑھے تین دہائی بنتی ہے لیکن اس طویل عرصے میں ان کے لکھنے کی رفتار بہت سست رہی ہے۔

"دریچے میں بجی حیرانی" احمد زین الدین کے افسانوں کا پہلا مجموعہ بھی ہے اور ان کی افسانہ نگاری کے دور ثانی کا پہلا پڑاؤ بھی .... اس کے بعد وہ نئے عزائم اور نئے تجربوں کے ساتھ نئے سفر پر روانہ ہوں گے۔

علی حیدر ملک

۲۷ دسمبر ۹۶ء

(پروفیسر علی حیدر ملک)

وفاقی اردو کالج، کراچی

۶۶۔ نور پلازہ، بلاک "ایم"

شمالی ناظم آباد، کراچی

"کبھی کبھی غور و فکر کے درمیان ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب خیال بولنے لگتے ہیں اور کہانی خود اپنے آپ کو بیان کرنے لگتی ہے۔ پورے شدّ و مدّ کے ساتھ ذہن تخلیق کے عمل میں مصروف ہو جاتا ہے۔ ایک ترتیب کے ساتھ جملے عبارت میں ڈھلنے لگتے ہیں اور وجود سراپا خیال کے تابع ہو کر ماورائیت کی سرحدوں سے جاملتا ہے۔ یہ کیفیت اتنی بے ساختہ اور بے ارادہ ہوتی ہے کہ اس پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لمحہ کو گرفت میں لانا، تخلیق کار کا اصل کام ہوتا ہے۔

ہر تخلیق کار کی طرح مجھ پر بھی یہ کیفیت بارہا طاری ہوئی ہے۔ فکر و احساس میں چراغاں سا ہوا ہے، کوئی واقعہ، کوئی خیال، درد کی کوئی کسک، احساس کو چھو کر اس لمحۂ بے نام کو زندہ کر گئی ہے اور جب بھی یہ "لمحۂ زندہ" میری گرفت میں آیا ہے تو کہانی تخلیق ہوئی ہے۔"

—— احمد زین الدین ——

"باشعور اور حساس انسان کی ایک بڑی مجبوری تو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اندر کے کہرام کو بیان بھی نہیں کر سکتا، اس کربلا کی صعوبتیں کسی کو سنا بھی نہیں سکتا، جو اندر کی دنیا کو تہ و بالا کیے رکھتی ہیں۔ ہر لمحہ کچھ کہے رہتا ہے، مگر کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ یہ کیسا عذاب ہے یارو! جو جسم و جاں سے ہر لمحہ نبرد آزما رہتا ہے۔"

—— احمد زین الدین ——

کہانیاں

—————★ ★ ★ ★ ★—————

دریچے میں سجی حیرانی

ذہن کے گھپ اندھیرے میں بیٹھے ہوئے واقعات کہانی بننے کو بیتاب ہیں۔ نہ انہیں فکر کی روشنی کی ضرورت ہے نہ بنت کے تانے بانے کی۔ بس آپ ہی آپ اٹھ کر یہ زندگی کی بکھری ہوئی کائنات میں اپنی شبیہ خود بنا رہے ہیں۔ جیسے بارش کے بیشمار قطروں سے خشک زمین کے اندر پڑے ہوئے بظاہر بے حقیقت بیج نمو پاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے دھرتی کا سینہ چیر کر سبزہ و گل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مسلسل روندے جانے کے باوجود تھوڑی سی نمی اور ہلکی سی گرمی پاتے ہی ان میں زندگی کی جولانی کہاں سے آجاتی ہے؟ یہ کیسی حیرانی کی بات ہے۔ بارش سے پہلے کل تک کسی کو کیا خبر تھی کہ سوکھی مٹی بھی بولنے لگے گی۔

ابھی وہ اس حیرانی کی اسیری سے رہائی بھی نہ پاسکی تھی کہ اتنے میں تقریب کے اختتام کا اعلان ہوا۔ لوگ چائے ناشتے کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے کرسیاں چھوڑ بے تحاشہ ہال کے دوسرے حصے کی جانب بھاگے۔ بڑے ہوٹلوں کے چائے ناشتے کی للک..... پلیٹ بھر بھر کر..... دوسروں کی پروا کیے بغیر..... ننگے بھوکوں کی طرح کیک پیسٹری منہ میں ٹھونسنے لگے۔ بقیہ لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ کوئی خالی پلیٹ ہی ہاتھ میں لئے رہ گیا اور شرافت میں مارا گیا کسی نے پلیٹ کو چھوا تک نہیں اور شرمسار سا ہو کر اپنی نشست پر واپس آگیا اور کہنے لگا،

"ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ کیا بدنظمی ہے۔ بڑے ہوٹلوں کا بھی لحاظ نہیں ہے۔ نہ ادب نہ آداب۔ بھلا یہ پڑھے لکھوں کی محفل ہے..... توبہ توبہ!" اس طرح کی آوازیں سب کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں، مگر بے اثر۔ بے حسی کا سارا منظر دیدنی تھا۔

وہ توصیف کے ڈونگرے سمیٹے اسٹیج سے نیچے اتری اور چائے لینے کے لئے خواتین کی جانب بڑھی، جہاں ان کے لئے خاص انتظام تھا تو نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی ٹولی نے آٹوگراف

لینے کے لئے اسے گھیر لیا۔

"مس! آپ نے بڑا اچھا مضمون پڑھا۔"

"شکریہ!"

"واقعی یار! کیا اختتام تھا۔"

"جی ہاں! آپ نے ہمارے منہ کی بات چھین لی۔" اس نے مسکراتے ہوئے پاس ہی کھڑی لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ شرم سے دوہری ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔

"آپ کتنی اچھی ہیں!"

"جی آپ بھی!" ہر کسی نے اپنے مطلب کی بات کی۔ ہر کوئی موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں سرگرداں تھا۔ وہ مسکرا مسکرا کر آٹو گراف دے رہی تھی اور دل ہی دل میں بیحد خوش تھی۔ یہ اس کی زندگی کا بڑا دن تھا۔

"زندگی سے پیار کرنا سیکھئے! حسن کی اپنی زبان ہوتی ہے۔"

شرمسار لڑکی کی آٹو گراف بک پر یہ جملے لکھنے کے بعد اسے قلم دیتے ہوئے اس نے اس کے تروتازہ خوبصورت چہرے کی طرف دیکھا اور "تھینک یو!" کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ سرور کے ایک لمحے نے اس کے اپنے وجود کو گدگدایا اور مسکراہٹ کی ایک روشن کرن اس کے چہرے پر پھیل گئی جیسے اس لمحے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔

ایک معمر خاتون نے چائے کی پیالی اور سینڈوچ کا ایک پیس اس کی طرف بڑھایا اور اس سے انگریزی میں کچھ کہا۔ اس نے تعریفی کلمات کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا اور اخلاقاً پوچھا،

"آپ کہاں رہتی ہیں؟"

"کلفٹن میں!"

پھر فوراً ہی انہوں نے پرس سے قلم نکال کر بروشر کی پشت پر اپنا نام اور فون نمبر لکھ دیا اور تاکید کی کہ میں فون ضرور کروں۔

گھر آکر وہ بستر پر دراز ہو گئی۔ تھکن سے اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ آنکھیں بند کیے وہ کسی خیال میں گم تھی۔ ہوٹل کا سارا منظر اس کی نگاہوں میں تھا.... مسکراہٹوں کے تبادلے.... جملوں کے ذریعے لڑکے لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ.... شرمیلے گلال چہرے.... تعریفی جملے.... ایک خیال نے اسے زندہ کر دیا جیسے کانوں میں کوئی کہہ رہا تھا،

"تعریف سے دل کو ٹھنڈک اور جذبات کو تازگی ملتی ہے اور پھر حسن کی تعریف!" اس لمحے اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ زندگی اس کے لئے ناکافی ہے۔ وہ کئی ایسی ہی زندگیوں کے لئے مسرت کے ان لمحوں کو قید کر لینا چاہتی تھی۔ اس کے وجود میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ شاید جبھی گھر سے باہر کھیلتے ہوئے بچوں کا مسلسل شور اسے اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اسی شور اور ہنگامے کے درمیان زندہ رہنا چاہتی تھی۔

عالمِ وارفتگی میں وہ بستر سے اٹھ کر قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بالوں پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر اپنے سراپے کا جائزہ لیا۔ دراز قد، اکہرا جسم، تیکھے نقوش اور نمایاں خطوط..... پھر اس پر غزالی آنکھیں، ابھرے ہوئے متناسب ہونٹ، کمر تک لمبے بال اور چہرے پر ہر حال میں سدا کھیلتی ہنسی.... اس لمحے بھی کسی خیال نے اسے گدگدایا تھا جیسے کچھ یاد آگیا ہو اور وہ بیساختہ ہنس پڑی تھی اور اپنے آپ سے بات کرنے کو اس کا جی چاہنے لگا تھا۔ اس میں ابھی تک وہ سب کچھ تو تھا جس کی تعریفیں کی جا رہی تھیں اور فون کے نمبر دئے جا رہے تھے۔ واقعی وہ اپنی تحریر کی طرح خوبصورت اور حسین تھی۔ ابھی کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا اس نے سوچا۔

"اس عورت نے فون نمبر کیوں دیا تھا؟" ایک سوالیہ نشان اس کے ذہن میں ابھرا۔ ابھی آگے وہ کچھ اور سوچنا ہی چاہتی تھی کہ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے دروازہ کھولا۔

"کیا بات ہے؟ آج بہت خوش لگ رہی ہو۔"

"ہاں! آج میرے مضمون کی بڑی تعریف ہوئی ہے اور مجھ سے آٹوگراف لئے گئے ہیں۔ آج میری وہ آرزو پوری ہو گئی جس کے میں خواب دیکھا کرتی تھی۔"

"تو گویا.... تم بھی بڑی لکھنے والی ہو گئی ہو!؟"

"ہاں شاید!...."

"پھر تو مبارک ہو!" اور وہ ایک دم سے شرما گئی۔

بچوں کا شور مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔ آج سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دنیا پہلے سے زیادہ خوبصورت لگنے لگی تھی اور سوکھی مٹی بھی بولنے لگی تھی جیسے اس میں کچھ نمو پانے کے لئے بیقرار سا ہو۔

رات خوابوں میں بسر ہوئی۔ سارا منظر وہی تھا۔ وہی شور.... وہی تالیوں کی بار بار گونج

.... لوگوں کا ہجوم .... ہال میں ہلکی ہلکی پھیلی ہوئی خوابیدہ سی روشنی .... فانوس میں جلتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قمقمے .... منقش دیواریں اور رہ رہ کر اٹھتا ہوا شور ۔ کئی بار اس کی آنکھ کھلی، مگر خواب کا نشہ اتنا گہرا تھا کہ اسے کھلی آنکھوں کے منظر اچھے نہ لگے اور آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں .... نیند اور خواب .... شور اور زندگی ۔

صبح بیدار ہوئی تو ہر چیز اجلی اجلی، شفاف سی لگی ۔ اس نے انگڑائی لے کر پچھلی رات کے خواب سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا،

"ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا .... آج سے بہت پہلے بھی .... اس وقت بھی جب پہلے پہل دنیا ایک دم سے بہت اچھی لگنے لگی تھی اور پور پور سے چاہے جانے کی امنگ دل کی دھڑکنوں میں سما کر رہ گئی تھی ۔" اس کے دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ کیوں نہ اس خاتون کو فون کیا جائے .... بھاری بھرکم مردانہ آواز نے جواب دیا ۔

"جی! وہ تو نہیں ہیں ۔ بس ابھی تھوڑی ہی دیر میں آجائیں گی ۔"

"ٹھیک ہے!"

"آپ کا فون نمبر پلیز! وہ آگئیں تو خود فون کر لیں گی اور ہاں! آپ کا نام ؟"

"جی! .... بس اتنا کہہ دیجیے گا کہ ہوٹل میں کل ایک فنکشن کے دوران ان سے ملاقات ہوئی تھی ۔ وہ سمجھ جائیں گی اور یہ فون نمبر بتا دیجیے گا ۔"

"جی بہتر! مگر نام بتانے میں تو کوئی ہرج نہیں ۔"

"جی .... خدا حافظ!"

فون رکھ کر وہ سوچنے لگی ۔ پتا نہیں یہ کون تھا ۔ جانے اس خاتون کا کیا لگتا ہو .... اور اسے میرا نام جاننے میں اتنی دلچسپی کیوں تھی ۔ پتا نہیں میسج بھی دے یا نہیں ۔ کئی سوال اس کے ذہن میں ابھرے .... خاتون نے بلا سبب اپنا فون نمبر کیوں دے دیا تھا ۔ وہ ایک نئی الجھن میں مبتلا ہو گئی تھی .... شاید وہ شخص اس خاتون کا شوہر ہو .... یا بیٹا .... !

"ہاں! مگر شوہر کو میرے نام سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے ۔ یقیناً وہ اس کا بیٹا ہو گا ۔ بڑے لوگ معلوم ہوتے ہیں، مگر ہاں! شاید وہ خاتون مجھے اپنا دوست بنانا چاہتی ہوں ۔"

پھر اس نے غیر ارادی طور پر پرس سے مضمون نکالا اور ایک بار پھر پڑھنے لگی ۔ یہ ایک افسانوی مجموعے پر تبصرہ تھا اور اس میں چند کہانیوں کا تجزیہ پیش کیا گیا تھا ۔ مسلسل ورق گردانی

کے بعد ایک کہانی کے تجزیئے میں وہ کھو گئی۔ کہانی کا انجام بڑا المناک تھا جسے پڑھ کر وہ اداس ہو گئی اتنے میں فون کی گھنٹی بجی....!

"ہیلو....!"

"جی ہاں.... مجھے آپ کا میسج مل گیا۔"

"ہاؤ آر یو....؟" اس نے انگریزی میں خیریت پوچھی۔"

"جی میں ٹھیک ہوں.... آپ کیسی ہیں؟"

"فائن....!"

"ہاں! میں نے اس روز آپ سے ایک سوال کیا تھا۔ دیکھیئے! میرا اردو زیادہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں انگلش لیڈی ہوں۔ میرا ایک ہی لڑکا ہے۔ اس کا شادی ہوا تھا، مگر اس کا بیوی ڈلیوری کیس میں فوت ہو گیا۔"

"کیا سوال کیا تھا؟ مجھے یاد نہیں۔"

"ہاؤ فنی! آپ کو یاد نہیں۔" ہنستے ہوئے اس نے حیرت کا اظہار کیا اور سوال دہرائے بغیر اپنے اور اپنے بیٹے کے بارے میں مسلسل بتاتی رہی۔

"میرا نام جوزیفین ہے۔ میں نے اس دن آپ کو بتایا تو تھا اور بروشر پر لکھ کر بھی دیا تھا میں نے ایک مسلمان سے لندن میں شادی کی تھی۔ آئی مین لو میرج۔ پھر اس نے میرا نام بدل دیا تھا اور مریم کہنے لگا تھا۔ ایک حادثے میں اس کا انتقال ہو گیا۔ پاکستان میں اس کے پاس بہت پیسا تھا۔ کئی کوٹھیاں تھیں۔ ایک ہی لڑکا ہے جس کے بارے میں، میں نے ابھی بتایا ہے۔ آپ بور تو نہیں ہو رہی ہیں؟"

"نہیں! میں سن رہی ہوں، مگر وہ سوال؟...."

"ارے بابا! بتاتا ہے ابھی....!"

اس روز فنکشن میں آپ، ہم کو بہت اچھا لگا.... سلم.... بیوٹی فل فیگر۔" میں نے اپنا لڑکا کو آپ کے بارے میں بتایا۔ آپ رائٹر ہے۔ آپ کا عمر بھی اس سے میچنگ ہے۔ وہ آپ سے مل کر آپ کو "پروپوز" کرنا چاہتا ہے۔ آپ ناراض تو نہیں ہوئیں۔ آپ میرا بیٹی کے مافک ہیں۔ میں اپنے بیٹے کی شادی کے لئے بہت پریشان ہوں۔ میں اکیلی ہوں اور وہ بھی بہت اکیلا۔ کسی کام میں اس کا جی نہیں لگتا۔ جب سے اس کا بیوی فوت ہوا ہے، وہ بہت اداس رہتا ہے اور ہاں! ہم دونوں کو

ایک لڑکا چاہیے۔

آئی مین.... اے سن آف مائی سن جو جائداد کا وارث ہو۔"

"یہ سب آپ مجھے کیوں بتا رہی ہیں.... اور وہ سوال ؟...."

"ہاں! ہم نے پوچھا تھا.... "آر یو میریڈ ؟ - (کیا آپ شادی شدہ ہیں ؟) - میرے اس سوال پر آپ صرف مسکرا کر رہ گئی تھیں تو میں نے سوچا آپ کا شادی نہیں ہوا ہے، تبھی ہم نے اپنا بیٹا کو آپ کی بابت بتایا اور خوب تعریف کی۔"

"او، نو!.... مسز جوزیفین! آپ نے غلط سمجھا۔"

"وہاٹ!"

اس نے فون اپنے بیٹے کو دے دیا۔

"ہیلو سوئٹی! مما ہیز ٹولڈ می آل ابباؤٹ یو۔"

"آپ کا آواز بیوٹی فل ہے۔ آئی ایم ان لو۔"

"اے یو! شٹ اپ۔ گیو می یور مدر۔"

"یس گڈ لیڈی! آر یو پری پیئرڈ ٹو میری مائی سن ؟ وی ہیو مچ منی.... آل فار یو۔"

"مجھے پیسے کا لالچ دیتی ہو! خاموش ہو جاؤ اور سنو!.... ذرا غور سے سننا "!.... آئی ایم آل ریڈی میریڈ.... اینڈ ہیو ٹو چلڈرن۔ انڈر اسٹینڈ! "اور اس نے غصے سے فون پٹخ دیا۔ اسے رونا آگیا کرب کی ایک لہر اس کے اندر سے اٹھی اور خوشیوں کے خیالی محل کو مسمار کرتی ہوئی وجود کا حصہ بن گئی۔ اسے اس لمحے یوں محسوس ہوا جیسے سوکھی مٹی اگر بولنا بھی چاہے تو، ہمیشہ نہیں بول سکتی اور وہ دریچے میں سجی حیرانی کی مانند اپنے سراپا کا جائزہ لینے لگی۔

(افکار - کراچی - ۱۹۹۵ء)

تازہ ہوا کے شور میں

قصہ کوئی بھی پرانا نہیں ہوتا۔ وقت کی رنگ آمیزی اس میں جان ڈالتی رہتی ہے۔ وقت کہ دھند بھری داستان ہے.... بہت دلچسپ.... بہت تازہ۔ میں ازل سے اس داستان کا حصہ ہوں۔

میرے پرکھوں نے جبر کی سیاہی سے جو داستان لکھی، میں اسے چاٹ چاٹ کر تھک گیا ہوں۔ مجھ سے پہلے بھی یہ عمل جاری تھا، پھر بھی اس سیاہی کی چمک ماند نہ پڑ سکی.... گہری.... اور گہری ہوتی گئی۔

وقت کے پہلو بدلنے کے باوجود نسلیں بند گلیوں میں سسکتی رہیں.... تازہ ہوا اور کھلی فضا کے لئے۔ وقت کا پہیہ گھومتا رہا.... نئی داستان، نئے ورق پر رقم ہوتی رہی۔ کہی.... ان کہی.... سنی.... ان سنی۔

میں گھبرا کر ایک مہربان سائے میں بیٹھ گیا۔

"میں سوالوں کے درمیان کب تک زندہ رہوں؟...." میں نے سائے سے استفسار کیا۔

برگد کا بوڑھا درخت، کبھی بولتا نہیں.... سایہ کئے چپ چاپ ہر آنے جانے والے کی راہ تکتا ہے۔ اس کے وجود میں پلتا ہوا ایک مانوس سناٹا اس کی زبان ہوتا ہے۔ خاموش لفظ.... سناٹے کی مانند ہوتے ہیں۔ اس کو نطق اور گویائی تب ملتی ہے جب کھلی ہوا کا تیز جھونکا اس کے وجود سے مس ہو کر گذر جاتا ہے اور تبھی لفظوں کی چہکار سے سوال ابھرتے ہیں جو ماضی اور حال، میں ننگے پاؤں پھرتے رہتے ہیں.... اپنی تفہیم کے لئے.... پھر مستقبل کی گہری دھند میں گم ہو جاتے ہیں، جس میں پاؤں رکھتے ہوئے خوف آتا ہے اور خوف کے درمیان سے کئی سوال سر اٹھاتے ہیں.... تب ایک آواز آتی ہے،

"مجھے سوالوں کے گرداب سے نکال - میں تھک گیا ہوں - ڈوب نہ جاؤں.... ماں!"

ماں کا سایہ بھی برگد کے سائے کی مانند ہوتا ہے جس کی ٹھنڈی، گھنی مہربان چھاؤں نسلوں کی پناہ گاہ ہوتی ہے - قافلے رکتے ہیں اور پھر انجانی منزلوں کی جانب چل پڑتے ہیں - وہ اپنی آنکھوں میں خواب بسائے اسے دیکھتی رہتی ہے - خواب.... جو ماں کا مقدر ہوتا ہے - میں جب اس میں جھانکتا ہوں تو وہاں مجھے کئی سوال نظر آتے ہیں - ایک لحظے کے لئے شعلہ سا چمکتا ہے جس میں درد کی بہت سی شکلیں دکھائی دیتی ہیں.... کئی نسلوں کا درد، مگر.... وہ فوراً ہی معدوم ہو کر میرے سامنے کئی سوال چھوڑ جاتا ہے.... پرکھوں سے کئے ہوئے سوال؟ میں اس کی آنکھوں کی دنیا میں جھانک کر کہتا ہوں،

"ماں! مجھے کل کے بارے میں بتا - وہ کل جو میرا نہیں تھا -"

وہ کھڑکی سے باہر کچھ دیکھنے لگتی ہے - باہر اداسی بال کھولے ننگے پاؤں پھر رہی ہے - کافی دیر تک وہ نظریں جمائے رکھتی ہے.... پلک جھپکائے بغیر - منظر ٹھہر سا گیا ہے - میں گھبرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوں - بالکل معصوم بالک کی مانند - پھر کھڑکی کو دیکھتا ہوں - اس کی زنگ آلود سلاخوں پر وقت کی کئی تہیں جمی ہوئی ہیں جیسے کئی کہانیاں ان کہی رہ گئی ہوں - سلاخیں.... جو صعوبتوں کی داستانیں ہیں اور ماں کی آنکھیں جن کو پڑھ پڑھ کر تھک چکی ہیں -

پھر انہیں کھردری سلاخوں کے درمیان سے دور بہت دور ایک پتھر کا مجسمہ نظر آتا ہے - ماں کی عقید تمند نظریں وہیں جا کر ٹھہر گئی ہیں جیسے اس کی دنیا وہیں تک محدود ہو اور آگے کی چہل پہل، رنگ و نور اور زندگی کی باقیماندہ رونقیں سب اس کے لئے بے معنی ہوں -

معاً لمحے بھر کو بیساختہ اس کے لب ہلتے ہیں،

"یہ اس عظیم انسان کی یادگار ہے جس نے وقت کا رخ موڑ کر ایک نئی تاریخ مرتب کی تھی، نسلوں کی کایا پلٹ دی تھی جو ہماری زندگیوں کے لئے ایک آدرش تھا - ابھی تک اس کی خاموش نظریں اسی نقطے پر مرکوز ہیں - لب غیر متحرک ہو گئے ہیں - میں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور کھلی آنکھوں میں تیرتی ہوئی نمی کو دیکھ رہا ہوں اور اس طوفان کو بھی محسوس کر رہا ہوں جو اس کے اندر اٹھ رہا ہے - وہ وقت کی کئی دہائیاں عبور کر کے اپنے وجود کے تپتے ہوئے صحرا میں اکیلی کھڑی ہے -

"ماں! تو کہاں ہے؟....

وہ جیسے خواب سے چونک پڑتی ہے اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتی ہے۔

"تیری کرید کی عادت نہیں گئی.... جبھی تو سوالوں کے درمیان گھرا رہتا ہے۔"

"ہاں ماں! مجھے وہ کچھ بتا جو میرا نہیں، مگر اس سے میرا تعلق، میرا رشتہ ضرور ہے۔ جیسے کل سے آج کا رشتہ۔ "کل"..... !اتیرا تھا.... اور "آج"..... جو میری کرید کا منبع ہے جس میں، میں ہوں بھی.... اور نہیں بھی۔"

وہ کہتی ہے،

"میرا کل.... اس گہرے اندھیرے غار کی مانند تھا جس میں روحیں چیختی چنگھاڑتی ہیں.... جیسے کوئی ان پر کوڑے برسا رہا ہو.... اور وہ تازہ ہوا کے لئے ترس رہی ہوں۔ ہر لمحے ہماری آنکھوں کے سامنے یہی پتھر کا مجسمہ ہوتا اور اس کے بتائے ہوئے اصول ہماری رگ و پے میں جاری و ساری ہوتے۔ ہم دائروں میں بند تھے.... سیتا کی طرح۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب لفظ ہمارے لئے بے معنی تھے۔ ہم صرف ضرورتاً بولتے ورنہ اپنے اندر سناٹے کو بسائے رکھتے۔ کام اور صرف کام ہمارے نصیب کا حصہ تھا۔ جب تو بھوک سے بلکتا تو تیری روٹی کے لئے ہم روایتی قطار میں لگ کر کارڈ کی اس تحریر کو پڑھتے رہتے جو ہمارے ہاتھ کی لکیروں کی مانند مقدر کا لکھا معلوم ہوتی۔

"مگر ماں! ایسا کیوں تھا؟"

پھر وہی سوال.... وہی کرید؟"

"ہم سے سوال کرنے کی عادت چھین لی گئی ہے۔ ہمارے لئے لفظ اپنا مفہوم کھو چکے ہیں ہم صرف اس لئے زندہ ہیں کہ موت ہمارے اختیار میں نہیں.... ؟ تیرے باپ نے بھی ایک بار کھلی فضا کی خواہش میں نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تھا اور پھر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ اس نے جب انصاف کے لئے زبان کھولی تو اسے سرد ترین علاقوں کی یخ بستہ ہواؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا.... پھر وہ نہیں لوٹا۔ ہاں! البتہ اب جب بھی برفیلی طوفانی ہوائیں اٹھتی ہیں تو میرے فرغل کا رواں رواں کانپ اٹھتا ہے اور میرے ذہن میں تلخ یادوں کے جھکڑ چلنے لگتے ہیں۔"

"ماں! یہ مجسمہ جھوٹ ہے۔"

"نہیں بیٹا! یہ ایک قوم کی ستر سالہ تاریخ ہے، ایک کلیے کی علامت ہے، حقوق انسانی کے

خواب کی تعبیر ہے، مظلوموں کا منشور ہے اور ایک تاریخی سچائی ہے۔"

"نہیں ماں! میں نہیں مانتا۔ اس نے ایک طبقے کو سب کچھ دیا اور دوسرے کو سہانے خواب.... وہ بھی گونگے کے خواب!.... یہ ڈھونگ ہے۔ میں اسے ڈھادونگا۔" میرے اندر تیز ہوائیں چلنے لگیں۔

ماں نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر مجھے اپنی گود میں سمیٹ لیا اور میں نے اس کے وجود کی گرمی پاتے ہی محسوس کیا کہ وہ سناٹا جو اس کی روح کا حصہ بن چکا تھا، وہ اس کی آنکھوں سے نمایاں ہو کر جذبوں کی گونج سے آشنا ہو رہا ہے۔ ہر طرف ایک شور سا بپا ہے۔ فضا میں تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے ہیں اور ایسا طوفان اٹھنے کو ہے جو آن کی آن میں سب کچھ مٹا کے رکھ دے گا۔ سچ کو جیسے زبان مل رہی ہے، لفظ بولنے لگے ہیں۔ سناٹوں میں تیز ہواؤں کا شور بھر گیا ہے۔ تاریخ کے بوسیدہ اوراق بکھرنے لگے ہیں۔

پھر جب شور تھما تو میں نے دیکھا.... فضا تازہ ہواؤں سے معمور تھی۔ لفظ کو معنی اور ازلی سناٹوں کو شوریدگی مل گئی تھی۔ ماں کی آنکھوں کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ سڑکوں پر بھیڑ تھی اسیروں کو بدلے ہوئے زمانے مل رہے تھے۔ فضا میں کشادگی کا احساس ہو رہا تھا۔ ہر طرف تعمیرِ نو کا چرچا تھا۔ وہ آگیا تھا جس کا وقت کو انتظار تھا۔

منظر بدل رہا ہے۔ جلدی جلدی.... سپر فاسٹ ٹرین کی رفتار سے بھی تیز۔ میں نے محسوس کیا کہ اچانک اس تبدیلی سے دل کے دھڑکنے کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ اسے E. C. G کی اسکرین پر آڑی ترچھی لکیریں بناتے ہوئے صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ میرے اندر کچھ ٹوٹ رہا ہے۔ باہر کا موسم اندر کی فضا سے متصادم ہے۔ باہر حبس تھا اور اندر صدیوں سے بکل مارے بیٹھا ہوا خوف کا گہرا سناٹا۔ بہت سارے لوگوں کی آوازیں آپس میں مل کر شور پیدا کر رہی ہیں۔

"دیوارِ نفرت" ڈھائی جا رہی ہے۔ دلوں کے فاصلے کم ہو کر مٹ رہے ہیں۔ جیسے تاریخ کے صفحات پر لکھے ہوئے الفاظ اپنا مفہوم کھو رہے ہوں۔ بوڑھا فلسفی دور کھڑا محبتوں کے درمیان حائل اس دیوار کو ٹوٹتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں نمی ہے شاید گزرے ہوئے وقت یا لمحۂ موجود میں تبدیلی کی نمی۔ وہ قریب آکر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دیوار کو چھوتا ہے اور ایک اینٹ اکھیڑ کر پوری قوت سے دور پھینک دیتا ہے اور تب بے اختیار اس کے دبے

ہوئے جذبے آنکھوں کی راہ بہہ نکلتے ہیں۔

تیز ہواؤں کا شور بڑھتا جارہا ہے۔

پرانی فکر تبدیل ہو رہی ہے۔ مردِ آہن کے ساتھیوں کی گرفت اصولوں پر کمزور ہوتی جارہی ہے۔ میں نے سنا.... اس کا ایک ساتھی کہہ رہا تھا،

"لوگ کہتے ہیں کہ میں تنہا زندگی گزار رہا ہوں، لیکن ہجوم سے وابستہ کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ مستقبل کے لئے کئی سوال چھوڑ جاتے ہیں اور تیز ہواؤں کی آوازِ باز گشت بن جاتے ہیں۔

ماں کی نظریں "ٹی وی" اسکرین پر جمی ہوئی ہیں۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ ہر علاقے میں آزادی کی نئی لہر دوڑ گئی ہے۔ منظر تیزی سے بدل رہا ہے۔ اکائی کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ عظیم طاقت کا خواب تعبیر کو ترس رہا ہے۔ میں ماں کے چہرے کو دیکھتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں نئی چمک اور شفاف چہرے پر عجیب سی روشنی نمو پارہی ہے۔ جیسے تاروں کی ٹھنڈی معصوم روشنی۔

رات کا پچھلا پہر ہے۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند سیاہ بادلوں کے بیچ ڈوبتا، ابھرتا انجانی منزلوں کی جانب رواں ہے۔ آسمان پر جگہ جگہ گھیرے سیاہ بادلوں کے پہاڑ جیسے ٹکڑے چاند کا راستہ روکے کھڑے ہیں اور آہستہ آہستہ اسے نگل لینے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ منظر انتہائی ڈراؤنا ہو گیا ہے۔ فضا میں نہایت پر اسرار خاموشی ہے۔ دفعتاً تاریکی نے چاندنی کو ہڑپ کر لیا۔ اتنے میں ایک شور بلند ہوا....

شبخون کی واردات اپنوں کے درمیان ہوئی ہے۔

حبس کا موسم ایک بار پھر دیوزاد درختوں پر اتر آیا ہے۔ تین دن تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ منظر کی تبدیلی رک سی گئی ہے۔ ہر طرف چیخ و پکار اور سراسیمگی بال کھولے پھر رہی ہے۔ کچھ لوگ مجھ سے کے گرد جمع ہونے لگے ہیں۔ ہر طرف بھیڑ ہے۔ ہجوم بڑھتا جارہا ہے۔ تیز ہواؤں کا شور انسانی آوازوں میں مدغم ہو گیا ہے۔ ماں کی نظریں پھر مجھ سے پر مرکوز ہو گئی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر اداسی نے پڑاؤ ڈال لیا ہے۔ تمام چہروں پر خوف نے جالے بن دیئے ہیں۔

لیکن اس خوف کے باوجود میرے دل سے صبح کا انتظار پھر بھی نہ ختم ہوا۔ میں نے سوچا مکافاتِ عمل کو کون روک سکتا ہے، حبس کا یہ موسم عارضی ہے، تاریکی روشنی کو کب تک نگلتی

رہے گی - ذہن پھر سوالوں کی کرید میں بھٹکنے لگا ہے - پھر پلک جھپکتے میں تاریکی کے بیچ ایک شعلہ سا لپکتا ہے - خلقت اس روشنی کی طرف ایک بار پھر دیوانہ وار بڑھنے لگتی ہے - بیداری کا شور بلند ہوتا ہے - ماں بھی اسی بھیڑ کا حصہ بن کر اس مجسمے کی طرف بھاگتی ہے ، جس کو اب بڑے بڑے دیو ہیکل کرین زمین کی گہرائیوں سے مجسم نکال لیتے ہیں - پھر اس سنگی مجسمے کو اٹھا کر شہر سے باہر پھینک دیا جاتا ہے - اس کا پتھر کا وجود تو باقی رہتا ہے مگر اس کے پیروں تلے سے وہ زمین چھین لی گئی ہے جس پر اس کی برسوں حکمرانی تھی - وہ اوندھا پڑا تھا - لوگ اس کے قریب سے ہنستے مسکراتے ، پیشانی پر بل ڈالتے گذر رہے ہیں - اس کے آس پاس بہت سے بچے کھیل رہے ہیں - کچھ بچے اس مجسمے پر پتھر پھینک رہے ہیں کچھ اس پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں - ان میں سے ایک اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اس کی گردن پر گھوڑ سواری کے سے انداز میں بیٹھا مسکرا رہا ہے - اس کی ماں دور کھڑی بڑے سکون سے یہ تماشہ دیکھ رہی ہے مگر بچے کی اس حرکت پر اس کے چہرے کا رنگ اچانک فق ہو گیا - اس لمحے اس کے دل میں بیٹھی ہوئی برسہا برس کی ہیبت اور عقیدت جوش میں آ گئی - اس نے بچے کے منہ پر تھپڑ مار کر مجسمے سے نیچے کھینچ لیا - وہ رونے لگا..... پھوٹ پھوٹ کر..... بلک بلک کر - ایک لمحے تک وہ اسے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتی رہی..... پھر جانے کس جذبے سے اسیر ہو کر اسے سینے سے لگا لیا - آنسو اس کی آنکھوں سے بے اختیار امڈے چلے جا رہے تھے اور تب ایک دم تیز ہواؤں کا یخ بستہ جھونکا اس کے رخساروں سے ٹکرا کر گزر گیا - اس کا وجود تازگی کے انجانے احساس سے مسکرا اٹھا - اس نے پیار سے مسکرا کر بچے کی طرف دیکھا - وہ ماں کی مسکراہٹ میں گم ہو کر اپنا دکھ بھول گیا اور بے اختیار یوں ہنسنے لگا جیسے اس کی ہنسی سے صبح فرد اطلوع ہو رہی ہو -

(اوراق - لاہور - جولائی ۱۹۹۲ء)

زرد موسم کی صلیب

جب پہلی بار سفر کاٹ کر وہ اس بوڑھے درخت کی گھنی شاخ پر اترا تو اسے یک گونہ مسرت ہوئی ۔ مسافتوں کی گرد سمیٹے سب سے اونچی پھننگ پر بیٹھ کر اس نے کھلی وادی پر نظر ڈالی تو ڈوبتی شام کے بیچ آدم زادوں کے بے ترتیب پڑاؤ کا منظر دیکھ کر اسے دھچکا سا لگا اور ایک انجانے خوف نے اس کے دل پر ایک ہلکی سی دستک دی ۔

"یہاں بھی وہ آزادی کا سانس نہ لے سکے گا ۔ شاید فطرت اسیر ہو چکی ہے اور کائنات کے مقدس خطے آدم زادوں کی یلغار میں ہیں ۔"

اس نے تھکے ذہن سے سوچا اور ابھی وہ پر سمیٹ کر بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ نزدیک کے پہاڑ پر سنگریزے چننے والے بچوں میں سے ایک نے عادتاً اس کی طرف پتھر اچھالا ۔ وہ اس کی زد سے بچتا ہوا اڑ کر دوسرے درخت کی شاخوں میں چھپ گیا ۔ اس کے غول کے اور ساتھی اسے تنہا چھوڑ کر کسی وادی میں درختوں کے بیچ پر سمیٹ چکے تھے ۔

شفق اندھیرے میں ڈوب رہی تھی ۔

دور دور تک پھیلے ہوئے درختوں کے بے جوڑ سلسلے تھے جن میں یخ بستہ ہواؤں کے نرم جھونکے دبی سسکیوں کی مانند لرز رہے تھے اور پتوں کے درمیان سے اٹھنے والا شور پتھریلے پہاڑوں کے دامن سے ٹکرا کر وادی کو پر اسرار بنا رہا تھا ۔ رات پڑتے ہی وادی کے پرندوں نے چپ سادھ لی اور خیموں میں زرد روشنی کے کمزور دائرے ڈوبنے ، ابھرنے لگے ۔ جس درخت پر وہ پر سمیٹے تھا اس کے نیچے آدم زادوں کے خیمے تھے جن میں بچوں کے رونے ، عورتوں کے بات بے بات لڑنے اور مردوں کے بلند آواز میں کچھ کہتے کہتے یک لخت چپ ہو جانے کی بے انت

کہانیاں تھیں۔ وہ آنکھیں موند کر سب کچھ سنتے ہوئے اندھیرے سے سمجھوتا کرنے لگا۔

سائبیریا سے روانگی کے وقت وہ جس آزار میں مبتلا تھا، اس کی ایک ایک یاد اس کے ذہن میں محفوظ تھی۔ وہاں بھی آدم زاد درپئے آزار تھا اور یہاں بھی.... وہاں بھی قید و بند کی صعوبتیں تھیں اور یہاں بھی خیموں کا حصار.... شاید زمین کا کوئی ٹکرا آدم زادوں کے آزار سے نہ بچ سکے۔

پھر وہ کہاں جائے؟.... اتنے میں ایک بچے کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی،

"ہم کب گھر لوٹیں گے؟" باپ نے ایک گہری سانس لی اور بچے نے دوبارہ کوئی سوال نہ کیا۔ ماں نے کہا،

"اب سو جاؤ!"

"بڑی ٹھنڈک ہے ماں! نیند نہیں آتی۔"

دوسرے خیمے سے آواز آئی،

"بڑی بھوک لگ رہی ہے ماں!"

جوان بیٹی نے ضبط سے تنگ آکر اظہار کیا۔

"کچھ دیر اور صبر کرو!"

"کب تک ماں۔؟

"صبر کی کوئی حد نہیں بیٹی! خیمے کے باہر بیٹھے ہوئے بوڑھے باپ نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور ان آوازوں کو اوپر جاتے ہوئے دیر تک محسوس کرتا رہا۔ سیاہ آسمان پر ستارے روشن تھے.... بہت روشن.... آنسوؤں سے بھی زیادہ۔ امدادی کیمپ سے روٹیاں تقسیم ہو چکی تھیں۔ بچوں کے رونے کی آوازیں اندھیرے خیموں کے حصار میں ڈوب گئی تھیں مگر، آپس میں باتیں کرنے کے سلسلے ابھی تک نہیں ٹوٹے تھے۔ وہ اپنے گھروں کو یاد کرتے اور اپنی زمین کو دشمنوں سے خالی کرانے کے خواب بنتے۔ کچھ دیر بعد خیمہ بستی کے باقیماندہ چراغ ایک ایک کر کے ٹھنڈے ہونے لگے۔ اندھیرے کا سفر جاری تھا۔ وہ پر سمیٹے، آنکھیں بند کئے اندھیرے حصار سے نکلنے والی ہر آواز کو ذہن کے کشادہ دامن میں سمیٹتا رہا۔ اس کا ساتھی بچھڑ گیا تھا جس کی یاد بھی اس لمحۂ کرب میں شامل ہو گئی تھی۔

پھر جب وادی میں مکمل سناٹا چھا گیا اور آدم زادوں کی نئی بستیاں رات کے سمندر میں ڈوب گئیں تو اچانک گھن گرج کی آواز سے وہ ایک دم چونک پڑا۔ وادی کے دوسرے درختوں پر

بھی بیداری کی آہٹ سنائی دی۔ دور کہیں بارودی سرنگوں کے دہانے کھل گئے تھے اور آدم زاد درپئے آزار تھا۔ رات بھر ایک خوفناک گھن گرج کی بازگشت وادیوں میں بال کھولے دوڑتی رہی وہ سہم کر دوسری شاخ پر بیٹھ گیا۔ فضا میں بارود کی بو پھیل گئی تھی اور وادی کا مقدس سکوت پامال ہو رہا تھا۔ اس مکدر فضا میں اس کی آنکھ نہ لگ سکی۔

رات کی سیاہ چادر میں روشن شگاف پڑ رہا تھا اور زمین سے سرگوشیاں کرتے ہوئے آسمان کا ہیولا واضح ہو رہا تھا۔ افق کے پار کھڑے ہوئے اکا دکا درخت قبروں کے کتبے دکھائی دے رہے تھے۔ آدم زادوں کی بستی میں زندگی کلبلانے لگی تھی۔ پھر وادی میں روشنی پھیل گئی اور اسے اپنے گرد و پیش ایک عجیب طرح کی تبدیلی کا احساس ہوا۔ درختوں کے پتے، جو کل تک سرسبز تھے زرد ہو گئے تھے اور فرش پر گرنے لگے تھے۔ اس اچانک تبدیلی پر وہ حیران تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنا سفر کیسے جاری رکھے۔ اسی پریشانی کے عالم میں جب اس نے زمین کی طرف نگاہ کی تو اسے درخت سے گرا ہوا بہر پیتا لاشوں کا انبار دکھائی دیا.... آدم زادوں کی بے کفن لاشیں۔ اس نے وادی کے دوسرے درختوں کو دیکھا، مگر وہاں بھی کچھ ایسا ہی سماں تھا۔ بے اماں شاخیں آسمان کو تک رہی تھیں اور زمین کی فضا بارود کے دھوئیں سے بھر گئی تھی۔ ہر طرف جبر کی تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ بڑے درخت چھوٹے درختوں کو اپنے حصار میں لینے کے درپے تھے۔ درخت کی ایک ننگی شاخ پر بیٹھے ہوئے اس نے سوچا کہیں اور پرواز کر جائے جہاں کھلی فضا ہو گھٹن سے پاک.... اور جیسے ہی اس نے پرواز کے لئے پر پھیلائے، اسے محسوس ہوا گویا اس کے سارے سفید پر خود بخود گوشت سے جدا ہونے لگے ہوں۔ وہ کسی لمحے زمین پر بکھری ہوئی لاشوں میں گر کر ڈھیر ہو جاتا کہ نہ جانے کس قوت نے اسے راستہ بدل دینے پر مجبور کر دیا۔ سمت تبدیل کرتے ہی اس کے پر دوبارہ نکلنے شروع ہو گئے۔ اسے سائبیریا کی یاد بالکل نہ آئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ فضا میں بے سمت اڑتا رہے اور زمیں پر کبھی نہ اترے.... کہ زمین کی فضا بارودی ہو چکی ہے اور آدم زادوں کی دنیا خود ان کے لئے تنگ ہوتی جا رہی ہے۔

(ماہِ نو۔ لاہور۔ ۱۹۸۱ء)

اندھیرے میں سبز کونپل

اندھیرے روشنی کی پیاس لئے اس کھڑکی تک آپہنچے تھے، جہاں میں اپنے دونوں ہاتھ کھلے پٹ پر رکھے گردن نیوڑھائے صلیب بن گیا تھا۔ علامتوں کی جستجو میں، نئے سفر کی آرزو میں پرانے گھر سے میں نے اپنا ناتا توڑنا چاہا، مگر اس سفر کی صعوبتوں نے مجھے عیسیٰ بنا دیا اور گھٹاٹوپ اندھیرے لشکر کی مثال میری طرف یوں بڑھے، جیسے چشم زدن میں مجھے سنگسار کر کے لہولہان کر دیں گے اور میں اپنوں ہی کے ہاتھوں مصلوب کر دیا جاؤں گا۔

میرے دل میں خوف کے اندھیرے اتر آئے، مگر دوسرے ہی لمحے مجھے محسوس ہوا گویا میری آنکھیں شفق رنگ ہو رہی ہوں اور میرے لب کربِ آگہی سے وا ہوا چاہتے ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو اندھیرے کے جال سے دور رکھنا چاہا، مگر میں الجھتا چلا گیا۔

میں نے زمین کی گود سے مٹھی بھر ریت اٹھائی، مگر انگلیوں کی درزوں سے لکیر کی صورت ساری ریت ماں کی کوکھ میں اتر گئی۔ لکیروں کو رشتوں کی پہچان تھی۔ ہوا کا بے ربط جھونکا آیا۔ یادوں کی ریت آنکھوں میں بھر گئی۔ کرب کا لاوا ذہن کے آتش فشاں میں پکتا رہا۔ اندھا آسمان بے نور زمین پر جھکا روشنی کے لئے ترستا رہا.... روشنی ناپید۔ اندھیرے مقدر..... تھکن معما.... ؟ کائنات میں ریت ہی ریت..... دل میں نخلستانوں کی تمنا اور چاروں اَور چنتا کا تپتا ہوا صحرا.....!

"یا خدا! روشنی"

میں نے دھوئیں کی یلغار سے آزاد ہونا چاہا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔

ٹرین اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔

میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھا اندھے آسمان کی پیشانی پر چمکتی ہوئی بوندیں دیکھ رہا تھا۔ چاند اندھیرے سمندر میں تیرتا ہوا میرے خیالوں کے روزن پر ٹک گیا تھا..... بے حرکت..... اجاڑ

موسموں کی مانند.....! اسٹیشن سے اتر کر پلیٹ فارم اور پھر ریلوے لائن عبور کر کے میں اس سنسان سی چھوٹی سڑک پر ہولیا جو کچھ دور بے بلب کھمبوں کے درمیان اپنا سفر طے کر کے ایک بڑی روشن سڑک سے جاملتی تھی اور پھر بنگلوں کی لمبی قطار کے درمیان اپنے وجود کے ثانوی ہو جانے پر آٹھ آٹھ آنسو بہایا کرتی ۔ مجھے اس کے کرب کا احساس تھا، مگر بنگلوں کی تیز روشنی مجھے اس سے بھی کہیں زیادہ مضمحل کر دیا کرتی ۔ پھر میں خود اپنے وجود کی اندھی کوٹھری میں مقید ہو جاتا .....!

میرے پاؤں اندھیرے کی دلدل میں دھنسے جا رہے تھے ۔ قریب سے گزرنے والوں نے مجھے نہیں پہچانا ۔ شاید میں اندھیرے کا حصہ بن گیا تھا، مگر میرا وجود تھا ۔ سگریٹ کو آخری بوسہ دے کر میں نے فضا میں اچھال دیا تا کہ میرا وجود روشنی کی رمق سے محروم نہ رہ سکے ۔ ایک لمحے کے لئے اندھیرے کے ننگے جسم پر سرخ سا شگاف بنا ۔ میں تڑپ اٹھا، مگر دوسرے ہی لمحے مجھے یوں لگا جیسے جگنو تاریکی کے سفر سے تھک کر گھاس کے ننھے جنگل میں اتر آیا ہو..... میں قدم بڑھاتا ہوا، مڑ مڑ کر سبزہ زار پر اس علامت کو دیکھتا رہا جو اب زخم کی مانند تھی ۔ زمین کا زخم.....!

پھر میں روشن سڑک کے کنارے رک گیا ۔ گاڑیاں زن زن گذرتی رہیں ۔ میرے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا ۔ رضیہ میرا انتظار کر رہی ہوگی ۔ مجھے فوراً گھر پہنچنا چاہیے ۔ بے خیالی میں میرے قدم تیزی سے اٹھنے لگے، پھر ایک زور دار آواز کے ساتھ بریک لگی ۔ ایک کار سامنے آکر رک گئی ۔

" دیکھ کر چلا کرو..... " ایک بھاری آواز ابھری اور میں کار کے سامنے سے گذر گیا ۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو..... ؟ رضیہ پپو اور گڑیا..... ؟ ایک برا سا خیال میرے ذہن کو چھو کر گذر گیا ۔

گھر پہنچا تو رضیہ کو ہمہ تن انتظار پایا..... پپو اور گڑیا سو چکے تھے.....

"آج بڑی دیر کر دی..... ؟ میرے دل میں کیسے کیسے برے خیالات آرہے تھے..... " اس نے ایک دم سے پیار کے ساغر چھلکا دیے ۔ میں خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا جہاں مجھے گذرے ہوئے قافلے کی گرد اڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور میرے کان جرس کارواں کی آواز سے آشنا ہو رہے تھے ۔ شاید یہ آواز مجھے دوبارہ قافلے سے ہمکنار کر دے ۔ میرے دل میں خواہشوں کے نرم جھونکے انگڑائیاں لینے لگے.....

"رضیہ! نہ جانے کیوں میں اپنے گرد اندھیرا سا محسوس کر رہا ہوں، جیسے میرا پیاسا وجود روشنی کے لئے ترس رہا ہو.... روشنی، جو مجھ سے گریزاں ہے اور جس کی چاہت میرے دل کے بند دروازوں پر دستک دے رہی ہے۔ میں اپنے آپ کے اندھیرے سے نکلنا چاہتا ہوں۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ میں کیسے اپنی ذات کے خول میں بند رہوں۔ میں علامتوں کو اجتماعیت کی وہ زبان کہاں سے عطا کروں جو سب کے دکھ کو سمیٹ سکیں۔ علامتیں بے زبان تو نہیں ہوتیں، مگر ان کو انفرادیت کی زبان دی جارہی ہے تو گویا میں اپنے غموں کا اشتہار بن جاؤں.... لیکن کیوں....؟ کسی کو میرے دکھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

"مگر آپ زمانے سے الگ بھی تو زندہ نہیں رہ سکتے۔" "وہ تو ٹھیک ہے، لیکن.... رضیہ! اب تم سو جاؤ۔"

"اور آپ...؟"

"مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔ میرے وجود کے گرد پھیلا ہوا اندھیرا مجھے سونے نہیں دے گا

میں میز پر بکھرے ہوئے چند نئے رسالوں کی ورق گردانی میں کھو جاتا ہوں۔ رضیہ کا جملہ بار بار میرے ذہن کو زخمی کرتا ہے۔

"مگر آپ زمانے سے الگ زندہ بھی تو نہیں رہ سکتے۔" تو گویا میں کوشش کے باوجود شاید زندہ نہ رہ سکوں۔ میری آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا جاتا ہے۔ میرے ذہن میں بہت سے ہیولے بنتے ہیں اور پھر ان میں کئی چہرے ابھرتے ہیں۔ میں ان کی شناخت نہیں کر پاتا اور کہانی کے عنوان پر میری نظریں جم جاتی ہیں.... "زرد پھولوں کا کانٹوں پر رقص۔" میں کہانی شروع کرتا ہوں۔ ایک ایک جملے کو کئی کئی بار دوہراتا ہوں، مگر آگہی کا پرندہ میری مٹھی سے پھسل جاتا ہے اور میں اس کے پیچھے سوچ کے صحرا میں آوارہ پھرنے لگتا ہوں۔ پھر کہانی کے اس ٹکڑے پر آکر میرا ذہن ہچکولے لینے لگتا ہے:

"قبروں کے اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان تیز روشنی کی سیاہ چادر اوڑھے، ناچتی روحوں کی آوارہ چیخیں سنتے سنتے وہ مردہ ہو چکا تھا۔ اب اس میں گھنگھروؤں کے بلکتے ہوئے بے ربط نوحوں کے سننے کی سکت باقی نہ تھی۔ تیز ہواؤں کا شور چنگھاڑتے ہوئے سمندر کے اوپر سے گذر رہا تھا اور وہ چپ کی چادر کے نیچے سسکتی ہوئی آرزوؤں پر ماتم کناں تھا۔ روشنی کی متلاشی آوارہ روحیں

ببول کے گھنے جنگلوں میں گم ہو گئی تھیں۔ جذبوں کی کڑیوں میں پروئے ہوئے مردہ لاشے زرد پھولوں کے رقص میں کھو گئے تھے۔ پھر اس نے کسمساتی ہوئی روح کی دیوار گرا دی اور اونگھتے جذبوں نے سیاہ چادر سے منہ نکال کر صبح کی دستک کا جواب دیا۔"

میں ذہنی ورزش میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ ایک ایک جملے کو کئی کئی بار پڑھتا ہوں۔ مفہوم کا دامن کبھی ہاتھ آتا ہے اور کبھی چھوٹ جاتا ہے۔ میں معنویت کے گورکھ دھندے میں الجھ جاتا ہوں اور میرا ذہن تھکن کی چوسنی چوسنے لگتا ہے۔ اس نئے سکے کی چمک میری آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ پھر میں سوچنے لگتا ہوں شاید میں اس قافلے سے ہمکنار نہ ہو سکوں۔ شاید میں زندہ نہ رہ سکوں، مگر نہیں .... میں زندہ رہوں گا میں قافلے سے جاملوں گا۔ زندگی کی معنویت سے نمودار ہونے والی کہانیاں زندہ رہیں گی اور موسموں پر اندھی ہواؤں کی مسافتیں ختم ہو جائیں گی۔ وراثتی خواب کے آئینے کبھی ریزہ ریزہ نہیں ہوں گے۔

رات خاموشی سے گزر رہی ہے۔ اندھیرے اپنے سینے میں رازوں کے دفینے لئے چپ چاپ کھڑے ہیں۔ رضیہ بے خبر سو رہی ہے۔ اس کا وجود کراہتے ہوئے جذبوں سے معمور ہے۔ میری نظریں اس کے سراپا کا جائزہ لے رہی ہیں، مگر اس وقت میری رگوں میں سرسراتی ہوئی خواہشوں کی بھٹی بھی سرد ہے۔ پپو اور گڑیا نہایت بے ترتیبی سے آڑے ترچھے سو رہے ہیں۔ پپو کا ایک پیر رضیہ کے سینے پر ہے اور اس کا سانس دھونکنی کی مانند تیز تیز چل رہا ہے، جیسے وہ خواب میں کسی رومانی سین سے دوچار ہو۔ میرے دل کی دھڑکن اچانک تیز ہو جاتی ہے۔ میں اپنی رگوں میں خون کی حدت کو بڑھتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ میں اس منظر میں الجھی ہوئی اپنی نظروں کو کھینچ لیتا ہوں۔ معاً میرے ذہن میں گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں اور میں اس قافلے کو دیکھنے لگتا ہوں جو دور پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔

رات کا پچھلا پہر ہے۔ زرد چاند کھڑکی کی سلاخوں میں اسیر ہے۔ جھکے ہوئے سیاہ آسمان پر ستارے اونگھ رہے ہیں۔ میرا ذہن سوچ کے صحرا میں بھٹک رہا ہے اور نگاہیں بہت دور راہب کے اس دیئے کو دیکھ رہی ہیں جس کی روشنی بھٹکے ہوئے قافلوں کی رہنمائی کرتی ہے۔ اچانک رضیہ خواب میں بڑبڑانے لگتی ہے،

"چھوڑ دو.... مجھے جانے دو! نہیں.... نہیں!" وہ رونے کی آواز نکالنے لگتی ہے۔ میں اس کے قریب جاتا ہوں اور آہستہ سے جھنجھوڑ کر اسے جگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ بیدار ہو کر میری

طرف دیکھتی ہے اور لاحول پڑھ کر پوچھتی ہے،

"آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔؟"

"ہاں! مگر یہ تم کیا بک رہی تھیں؟"

"کچھ نہیں! بس خواب میں ڈر گئی تھی۔"

"تم کس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں؟"

"کچھ نہیں! برا سا خواب آیا تھا۔"

"مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟"

"بھلا آپ سے کیوں ناراض ہونے لگی!" اس نے مسکرا کر میرے ذہن سے ایک غلیظ وسوسہ دور کر دیا۔ وہ کئی ماہ سے محرومِ التفات تھی۔

"کیا وقت ہوا ہو گا؟" اس نے نشے کی سی کیفیت میں پوچھا۔

"صبح کے پانچ بجنے والے ہیں۔"

"کیا آپ دفتر نہیں جائیں گے؟"

"شاید نہیں۔"

"بڑی مشکل سے دو سال کی جد و جہد اور سفارش کے بعد ملازمت ملی ہے۔ اسے تو کہانی کی نذر نہ کیجئے۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں شکایت کی۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ذہن کا ایک بلب بھک سے ہو کر رہ گیا ہو۔ میں نے اپنے گرد اندھیرے کے حلقے کو تنگ ہوتا محسوس کیا۔ موذن کی آواز کے ساتھ قافلے بیدار ہو گئے۔ پرندوں نے عبادت کے لئے اپنی اپنی چونچ کھولی اور صدائے جرس سے پورا صحرا گونج اٹھا۔ میں نے زادِ راہ لے کر اس قافلے کی طرف بڑھنا چاہا، جو مجھ سے دور تھا۔

سفید کبوتروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز آ رہی تھی۔ کنویں کی منڈیر پر فضلو بابا کا لوٹا موجود تھا اور نیم کے درخت سے اندھیرے یوں رخصت ہو رہے تھے جیسے نویلی دلہنوں کے جسم سے کنوار پن کی خوشبو! میں کوشش کے باوجود اس قافلے میں شریک نہ ہو سکا، البتہ گھنٹے کی آواز برابر میرے کانوں سے ٹکراتی رہی، مگر یہ آواز اب مجھے نالۂ جرس معلوم ہو رہی تھی۔

(افکار کراچی۔ ۱۹۸۱ء)

اَدھورے خواب کا غم

وہ خوابوں کی الگ تھلگ بستی میں رہتے۔ دنیا سے ان کا ناتا ٹوٹا تو نہ تھا، مگر وہ جیسے کٹ کر رہ گئے تھے۔ ہوتے ہوئے بھی نہ ہونے کے بوجھ تلے دبے کسمساتے رہتے۔ ان میں رشتہ خوابوں کا تھا۔ وہ کھلی آنکھوں سے دور خلاؤں میں خوابوں کے در کھولتے اور ماضی کے روزن سے حال کی اندھی کوٹھری میں کچھ ڈھونڈتے۔ پھر خالی ہاتھ مستقبل کے جھروکے سے خوابوں کی فصل بوتے اور ویران کھیتوں سے حسرتوں کی فصل کاٹتے۔ وہ جب بھی ملتے ایک دوسرے سے استفسار کرتے، گویا وہ مدتوں سے کسی جستجو میں تھے۔

پہلا کہتا:۔

"خوابوں کی تعبیر فرسٹریشن ہے، مگر خواب دیکھنا میری فطرت ہے۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، میری آنکھیں خوابوں کے ریشم بنتی ہیں۔ آنکھ لگ جائے تو خواب پچھتاوے کا ہیولا بن کر ڈراتے ہیں اور کھلی آنکھوں سے دیکھے ہوئے خواب پیار کے موسم کی مانند لگتے ہیں۔ ذہن کے جنگل میں خوابوں کے خوش نما منظر لہلہاتے ہیں۔ میں اس میں کھو جانا چاہتا ہوں۔ تب آنکھیں خوابوں سے کشید کئے ہوئے منظر پر کھل جاتی ہیں۔ کئی آوازیں گونجتی ہیں.... مانوس، جانی پہچانی مگر شناخت کو ترستی ہوئی آوازیں.... جو خواب ہیں.... محض خواب۔ میں کب سے خوابوں کے اس حصار میں اسیر ہوں، مجھے یاد نہیں۔"

دوسرا اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا،

"شاید وہ شعور کو پہلا دن تھا جب پاپڑ جیسی خشک روٹی کو نیم گرم پانی میں ڈبو کر میرے منہ میں ڈالا گیا اور میری آنکھوں سے آرزوؤں کے گرم گرم خواب قطرہ بن کر میری ماں کے ہاتھوں پر ٹھہر گئے۔ ماں نے چمکارتے ہوئے پیار سے اپنے ہاتھوں کے کشکول میں میرے رخسار کو تھام

رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں، میں نے جو ستارے دیکھے تھے، وہ آج بھی میرے خوابوں کے آسمان پر روشن ہیں۔ مجھے وہ آنکھیں یاد ہیں جس میں میرے آنے والے دنوں کے خواب تیر رہے تھے۔ جانے کیسے کیسے سہانے خواب جو ہر ماں اپنے بچے کے لئے دیکھا کرتی ہے۔ باپ گم صم رہتا کہ زمین کا کوئی اور مالک بن بیٹھا تھا، مگر وہ اپنے کھیتوں کی روش سے گزرتے ہوئے اکثر نادیدہ خوابوں کی فصل کاٹتا۔ کسان سے جب اس کا کھیت چھن جائے تو اس کے پاس آنسوؤں کی جگہ خواب رہ جاتے ہیں۔ جو آنے والی نسلوں کو ورثے میں ملتے ہیں اور پھر نسل در نسل یہ سلسلہ خوابوں کی مانند چلتا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب گورے ملک چھوڑ گئے اور ہمیں نئے خواب دے گئے۔ ماں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھے بغیر مٹی بن گئی۔ باپ نے جیتے جی میرے لئے خواب دیکھے، مگر پھر وہ بھی بند مٹھی میں اندھیرے کی مانند زیادہ دیر زندگی کی گرفت میں نہ رہ سکا اور خواب ہو گیا۔ اب اس دھرتی پر میں ہوں اور میرے ورثے کے خواب.... ادھورے.... نامکمل.... تعبیر ناآشنا۔: تب سے اب تک میرے چہرے پر گرد کی دبیز تہہ جمی ہوئی ہے۔ یہ گرد چہرے سے کب اترے گی، مجھے نہیں معلوم۔:

تیسرا، جو بولنے کے لئے بڑی دیر سے بے چین تھا اور کئی بار کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا، کہنے لگا،

"میں جب اپنے بارے میں سوچتا ہوں تو خوابوں کے حصار میں الجھ کر رہ جاتا ہوں۔ میں نے اپنے گرد کتنے ہی خواب جمع کر رکھے ہیں۔ میرے یہ بچے، جو میرا خواب ہیں، یہ بھی میری طرح اپنے مستقبل کے چھوٹے بڑے خواب بن رہے ہیں۔ ڈاکٹر، انجنئر، پروفیسر، تاجر، افسر.... جانے کیا کیا خواب ہوں گے ان کے.... دور دیس نکل جانے اور منزلوں کو پالینے کے خواب۔ میں ان کا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ میرے چہرے کی گرد ان کے چہرے پر نہ پڑے تاکہ ان کے خواب دھندلا نہ جائیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میرا پہلا بیٹا سماجی انصاف کی خاطر سڑک پر نکل آیا اور ہجوم کے آگے گولیوں کی بوچھار کو سینے پر روکتے ہوئے انصاف کی سربلند فصیل تو بن گیا، لیکن اس کے خواب ادھورے رہ گئے۔ دوسرا بیٹا وطن کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے مٹی کی گود میں اتر گیا۔ میں اور اس کے خواب ترستے رہ گئے۔ اب میں تنہا زندہ ہوں کہ میرا کوئی خواب نہیں، کوئی بیٹا نہیں.... مگر شاید نہیں! میرے تو کئی اور بھی بیٹے ہیں بلکہ بہت سے بیٹے ہیں جو اپنے اپنے

خوابوں کی تعبیر دیکھنے کے لئے میری آنکھوں میں تک رہے ہیں۔ انہیں تعبیر کب ملے گی، مجھے نہیں معلوم:"

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی آواز جذبات کے اندھے کنویں میں ڈوب رہی تھی اور نگاہیں دور اس افق کو دیکھ رہی تھیں جو سرحدوں سے مل جاتا ہے۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ پھر وہ حیران ہوئے اور اس کی پلک جھپکنے کے منتظر ہوئے، مگر ان میں تو شفق اتر آئی تھی:۔

"چوتھا، جو ان باتوں سے بے نیاز اخبار میں گم تھا، سرخیوں سے نظریں اٹھاتے ہوئے کہنے لگا،

"خواب کون نہیں دیکھتا! یہ تو زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ یہ نہ ہوں تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے اور زندگی کا سلسلہ بھی تو انہیں سے قائم ہے۔ مجھے دیکھو! میں سماجی برائیوں کو دور کرنے کے خواب دیکھا کرتا۔ سچ کی روشنائی سے جھوٹ کے کورے کاغذ کے تن کو میلا کرتا، مگر اسے آئینہ مثال نہ بنا سکا۔ میں مدتوں سے یہ خواب دیکھ رہا ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے کے خواب اور پھر یہاں آنے کے بعد کے خواب اور اب تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے اندر کا کورا کاغذ بھی میلا، غلیظ اور جھوٹ کی طرح بوسیدہ ہو چکا ہے۔ خود میرے بچے میرا اخبار نہیں پڑھتے، شاید وہ خبروں میں سچ تلاش کرتے ہیں۔ پاگل ہیں۔ بیوقوف کہیں کے۔ اپنے اندر کی سچائی کو دوسروں میں دیکھنا چاہتے ہیں اور پھر وہ بھی آج کے دور میں!

بات یہ ہے کہ میں بھی تو ان کے پاس نہیں رہتا۔ رات گئے جب واپس لوٹتا ہوں تو میری بیوی کھلی آنکھوں سے کمرے کے کھلے دروازے پر نظریں جمائے خواب دیکھا کرتی ہے.... بہت سارے خواب.... بچوں کے، میرے، اپنے مکان کے، عیش و آرام کے.... سچے موتیوں جیسے آبدار خواب جو جھوٹ کے پیراہن میں سجے ہوئے ہیں، مگر میں جیسے ہی اس کے سامنے جاتا ہوں، اس کے سارے خواب چکنا چور ہو کر دہلیز پر بکھر جاتے ہیں۔ تب مجھے خود اپنا وجود اس کے سامنے جھوٹ معلوم ہونے لگتا ہے.... خبروں کی طرح یا خواب کی طرح۔! میں ٹھٹھک کر اس کو دیکھتا ہوں اس کی آنکھوں میں کچھ ڈھونڈنا چاہتا ہوں، مگر حسرتوں کے اس ویرانے میں مجھے کیا ملے گا، مجھے نہیں معلوم:"

آخری آدمی نے، جو بڑی دیر سے کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھا اور آدھے ذہن

سے ان کی باتوں کو سن رہا تھا، بڑی تلخی سے مسکرایا اور مدبرانہ انداز میں کہنے لگا،

"بچپن سے لے کر آج تک میں بھی خواب ہی دیکھ رہا ہوں - میرے دل میں بار بار یہ خواہش خواب کی طرح ابھری کہ میں ساری دنیا کے دکھ سمیٹ لوں اور اپنے اطراف میں پھیلے ہوئے انتشار کو امن کی جھولی میں ڈال لوں، مگر یہ بھی خواب ہے - ساری عمر قلم سے رفاقت کرنے کے بعد بھی مجھے کیا ملا؟.... خواب اور صرف خواب -: معاشرے اور گھر والوں کی نظر میں میری کیا وقعت ہے؟ شاید میرے بچے اپنے خوش حال ساتھیوں کی صحبت میں بیٹھ کر مجھ سے نفرت کرتے ہوں یا مجھے "ڈس اون" کرتے ہوں میرے اپنے ساتھی زندگی کی دوڑ میں بہت آگے نکل گئے - ان کے پاس جدید دنیا کی ساری آسائشیں مہیا ہیں اور میں آج بھی پرانے ہولڈر سے نئے خواب لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں - معاشرے میں میرے لئے صرف خواب رہ گئے ہیں جن کے سہارے، ہم سب جی رہے ہیں - شاید یہی سبب ہے کہ مجھے خوابوں سے محبت سی ہو گئی ہے کھلی آنکھوں سے دیکھے ہوئے خواب اچھے لگتے ہیں - اگر یہ نہ ہوتے تو ہم پتھر کے ہو گئے ہوتے، مگر آخر کب تک، ہم خوابوں کے سہارے زندہ رہیں گے،"

"تو پھر؟...." سب نے ایک آواز ہو کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے استفسار کیا - ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

دفعتاً ان میں سے ایک نے چیختے ہوئے کہا،

"دیکھنا! وہ مکان کی کھڑکیاں آپ ہی آپ زور زور سے بجنے لگیں اور یہ درخت.... یہ تو ہل رہا ہے -"

تیسرے نے چیخ ماری،

"مجھے تو زمین کھسکتی ہوئی معلوم ہو رہی ہے اور میں.... میں.... خود ہل رہا ہوں -"

چوتھا بولا،

"لیکن یارو! کیا تم خواب میں یہ سب کچھ بک رہے ہو؟ کیا تمہارے خواب ٹوٹ رہے ہیں، اور وہ میرے بچے، میرا مکان، میری کائنات.... مگر نہیں! تم سب سچ کہہ رہے ہو - شاید میں بھی زمین کے بھونچال میں آگیا ہوں - مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ بھونچال خود میرے اندر بھی آگیا ہو -

شاید میں منتشر ہو رہا ہوں، بکھر رہا ہوں اور ہم سب بھی.... بلکہ سارے کے سارے معدوم ہو

رہے ہیں۔

یہ کیسا.... یہ کیا، مگر ہمارے خواب؟"

ساری آوازیں ایک ہو کر دور خلاؤں میں گم ہو گئیں، لیکن نہیں! اگر سنا جائے تو وہ آج بھی سنائی دیتی ہیں.... خواب کی سی لگتی ہیں جیسے اندر کی آواز۔

(افکار کراچی ۔ ۱۹۸۴ء)

میں بھی اسی عمر سے تحصیل علم کی راہ میں گم صم بھٹکتا رہا۔ قوتِ گویائی کی بہت سی موجیں ذہن و ذات کے اندر تندیِ صہبا کی طرح اٹھتیں اور کنارِ لب تک آکر واپس ہو جاتیں ۔ اندرون ذات، انسانی مجبوریوں، محرومیوں اور ناامیدیوں کی بہت سی کتھائیں کربِ کربلا کی طرح اظہار کو ترستی رہ جاتیں ۔ دکھوں کی پے بہ پے ضربتوں نے دنیا کے نہ جانے کتنے ہی انسانوں کی طرح مجھے بھی گم صم کر دیا۔"

—۔ احمد زین الدین —۔

ڈھلتی دُھوپ کا نوحہ

بند دروازوں کو کھولنا عذابِ جاں ہے!

ہوا کے نرم، دلگیر جھونکے اندر آکر یادوں کو گدگداتے ہیں، سکون کی قبا کھولتے ہیں اور ننگے درختوں کو پتوں کی یاد سے آشنا کردیتے ہیں۔ پھر بھوری روشنی بھی چپکے سے در آتی ہے اور تصویر کے سیاہ نیگیٹو کو اجلا کردیتی ہے۔ کیمرے کی ساری صناعی دھوپ کی ہلکی چادر اوڑھ لیتی ہے اور نرم دلگداز گدوں کی خواب آور گرمی یادوں سے بچھڑ جاتی ہے۔

بند دروازے کو بند ہی رہنا چاہیے!

دریچوں پر نیلے پردوں کی چھاؤں پڑی رہے کہ روشنی کے نیزے دکھ دیتے ہیں۔ باہر کی دنیا اندر کی دنیا سے زیادہ پر آشوب ہے، مگر سکوت کی چادر اندر بھی تو تار تار ہے۔ اندھیرے کی چادر سربستہ رازوں کی دبیز چادر ہے۔ اس میں سوراخ ہو جائے تو روح ننگی ہو جاتی ہے اور جسم کا سورج سوا نیزے پر معلق ہو جاتا ہے۔

بند دروازے ابھی تک بند ہیں!

آنکھوں کے دریچے کب کے کھلے ہیں۔ زنداں کے روزن کی طرح ان پر نیلی چادر تنی ہے سامنے کا منظر صاف ہے۔ ملگجی روشنی میں دیوار پر کیلنڈر معلق آہوں کی مثال جھول رہا ہے۔ قدِ آدم تصویر مسکرا رہی ہے۔ کیمرے کی چابکدستی نے عورت کے سفید، گندمی جسم کو ماہی گیروں کے مضبوط جال میں جکڑ رکھا ہے۔ اس کے دراز قد اور چکنے سڈول بدن کے فراز کو حیا کے تاروں نے لپیٹ لیا ہے۔ ہمکتے ہوئے جوان جذبے پابہ زنجیر ہیں۔ اس تصویر کی ہر چیز اتنی واضح ہے کہ اس کا بیان احساس کے تاروں کو جھنجھوڑ سکتا ہے۔ سمندر پار کی دنیا کھلے احساس اور آزاد جذبوں کی دنیا ہے۔ اس میں کیمرے کی آنکھ شرمندہ نہیں ہوتی۔ درختوں سے پتے گر جائیں تو شاخیں بے اماں ہو

جاتی ہیں، جسم سے لباس اتر جائے تو روح حسرتوں کے ویرانے میں پاگل ہوا بن جاتی ہے۔

آنکھوں کے دریچے بک شیلف پر کھل گئے ہیں۔

اس میں مختلف زبانوں کی کتابیں قرینے سے سجی ہیں۔ ہر کتاب میں گرم جذبے دفن ہیں۔ ان جذبوں کو کرید کرید کر اس کے ذہن کی انگلیاں شل ہو چکی ہیں۔ ایک کتاب کے سرورق پر اس کی آنکھیں روزن بن گئی ہیں اور اس کے ذہن کی دوسری آنکھ کیلنڈر کی تصویر کے خدو خال میں الجھی ہوئی ہے۔ اجنتا اور ایلورا کی عورت لباس سے بے نیاز کیمرے کی سفاکی کا نشانہ بنی ہے۔ اس کے ہاتھ سے کتاب فرش پر گر پڑتی ہے اور حیا کی چادر دریچوں کے گرد تن جاتی ہے۔ کیمرے کی سیاہی میں لپٹی ہوئی روشنی بے بس ہے۔ اندر کی دنیا پُر آشوب ہو گئی ہے۔ کمرے کی نیلی، پنک اور زرد دیواریں رونے لگی ہیں۔ باہر تیز ہوا چل رہی ہے۔ درختوں کے سارے پتے بیوفا موسم کی قبر پر ڈھیر ہو چکے ہیں۔ لرزتی شاخیں بے اماں ہیں۔

بند دروازے پر ہلکی دستک نے سکوت کی چادر تار تار کر دی۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے کی آواز کانوں کی راہ دل میں اتر گئی، مگر ذہن بیزاری کے کرب سے چیخ اٹھا.... دفتر.... دفتر، کام.... کام۔ چھٹی کے چند دن بھی میسر آجائیں تو قیامت ٹوٹ پڑتی ہے ذہن کے دروازے کھل جاتے ہیں، اجاڑ موسموں کے جھکڑ چلنے لگتے ہیں۔ مگر آج تو دروازے بند تھے، کل صبح کھل جائیں گے اور گرد ہوتی ہوئی مسافتوں میں زندگی کا قافلہ پھر رواں ہو گا۔

ٹائپ رائٹر پر انگلیاں بے سرے گیت گاتے تھک گئی ہیں۔ باس نے کال بیل بجائی اور اس کے کمرے کی ایک کرسی وجود کی آگ سے جل اٹھی۔ انگلیوں میں پنسل کراہ رہی ہے۔ لال لکیروں والے کاغذ کے جسم پر پنسل کی باریک نوک چبھنے لگی ہے۔ کاغذ کا احساس مردہ ہو چکا ہے اور پنسل کی نوک باریک سے باریک تر..... نیزے کی مانند.... احساس کے کورے کاغذ پر چبھتے ہوئے نیزے۔

باس کی آواز بند کمرے میں الجھنے لگی ہے۔ اس کی نظروں کے نیزے پنسل سے ہوتے ہوئے ہاتھ کی کلائی اور انگلیوں کی پوروں کو چھیدنے لگے ہیں۔ مرصلہ نے یہ چبھن محسوس کر لی ہے پہلے اس چبھن کی ٹھنڈک وجود کو گرم کر دیا کرتی مگر آج....! آنکھوں کے دریچے پر گہری نیلی چادر تنی ہوئی ہے۔ سکوت گہرا ہو گیا ہے اور کمرے کی ہر چیز بھیدوں کی دیوار لگ رہی ہے۔ سرگوشیاں ان سے ٹکرا رہی ہیں اور یہ فصیلیں ناقابل عبور ہوتی جا رہی ہیں۔ ذہن کی فضا میں تیز جھکڑ چلنے لگے

ہیں۔

پھر جب اس کے ذہن نے چپ کی چادر کو ہٹایا تو اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں نے نوحہ کیا اس کی نظریں آج ان ہاتھوں میں کیوں الجھ رہی ہیں۔ دس سال کی رفیق آنکھیں آج نوحہ کناں ہیں۔ پھر جیسے اس کی آنکھوں کے بند دریچے اپنے وجود کی چہار دیواری میں کھل گئے۔ اس نے پوروں میں مضبوطی سے پکڑی ہوئی پنسل کو دیکھا۔ پنسل سے زیادہ نیلی رگیں واضح تھیں.... خون کی گردش، حدت سے محروم ذہن کے درخت سے پرندہ پھڑ پھڑا کر اڑ گیا۔ پھر آنکھوں کے دریچے آمنے سامنے کھل گئے۔ شاید کورے کاغذ پر تحریر مکمل ہو چکی تھی.... انگلیاں ٹائپ رائیٹر پر رک رک کر چلنے لگیں۔ ذہن کی تحریر گنجلک تھی۔ انگلیوں سے لے کر کلائی تک کی جلد چادر کی مانند تن گئی تھی سخت، بے جان، بے حرکت چادر۔ احساس کے ویرانے میں پت جھڑ کا شور ہے۔ وجود کے گرد تنی ہوئی دھوپ کی چادر کمزور ہو گئی ہے اور جگہ جگہ سے گلے سڑے دھاگے آپ ہی آپ ٹوٹ رہے ہیں۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے ہیں۔ روشنی کا دروازہ آہستہ آہستہ بند ہو رہا ہے۔ ہوا ٹھہرے ٹھہرے قدم رکھ رہی ہے اور ڈھلتی دھوپ کا نوحہ ابھی تک جاری ہے۔ بس کی گھٹی گھٹی فضا سے نکل کر اس نے سکون کا سانس لیا، مگر اس کے نتھنوں میں سانسوں، پسینوں اور ڈیزل کی بو ابھی تک بھری ہوئی ہے اور گھٹن کے احساس سے اس کا ذہن بوجھل ہو رہا ہے۔ تازہ ہوا اس کے جسم کو چھو کر گذر رہی ہے۔ پھر جب وہ گھر پہنچی تو اس کا وجود تھکن کے احساس سے چور تھا اور اس کا ذہن اپنے ہی ہاتھوں کی رگوں میں محبوس تھا۔

کمرے کی خواب آگیں فضا وجود کے احساس سے جاگ اٹھی۔ نرم گدوں میں زندگی سرسرانے لگی۔ پھر تکیے نے دل سے اٹھے ہوئے کئی طوفانوں کی ٹھنڈک محسوس کی۔ آج اس کے ذہن کے تمام دریچے آپ ہی آپ کھل گئے تھے۔ بیرونی آوازوں کے جال اس کی گرفت سے باہر تھے اور کئی تصویریں ذہن کے کیمرے میں اتر آئی تھیں۔ چہرے ہی چہرے، آنکھیں ہی آنکھیں.... روشن، چمکدار، مسکراتی ہوئی، مردانہ وجاہت کے نشے میں چور آنکھیں۔ مسکراتے ہوئے سرخ ہونٹوں کے لبریز پیمانے.... سکھیوں، سہیلیوں کے گرد تنی ہوئی دھوپ کی قناطیں۔

پھر دھوپ ڈھلنے لگی۔ وہ منڈیروں سے اترتی ہوئی دھوپ کو کھلی آنکھوں کے روزن سے دیکھتی رہی۔ دروازے بند تھے۔ نیلگوں پردے سیاہی مائل ہو گئے تھے اور اندر کی تاریکی

دیواروں کے بیچ الجھ گئی تھی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب اس کی انا کی کتاب بند ہو گئی اور سرورق پر گرد جم گئی۔ ذہن مشین کی طرح یادوں کے پیراہن کی رفوگری میں مصروف ہو گیا۔

پھر کئی اور چہرے ذہن کے بوسیدہ افق پر اتر آئے۔ ناموں کی تختیاں آویزاں کرنے کو اس کا جی نہ چاہا.... کئی فون نمبر، کئی چہکتی مہکتی شامیں۔ اور زندگی سے بھرپور دن۔

پھر وہ اپنی ہی ہنسی کی آوارہ لہروں میں کھو گئی۔ وہ ہنستے ہنستے رونے لگی اور اندر کا آشوب آنکھوں تک آ گیا۔ ذہن میں نرم گدوں کی گرمی عود کر آئی اور دوسری کروٹ نے پیٹھ کو ٹھنڈک کے لطیف احساس سے دوچار کیا۔ اس کا وجود پھوڑے کی مانند تھا، مگر اب درد کی کسک کم ہو گئی تھی۔

پھر اس کے کانوں میں کیسٹوں کا شور گونجا۔ رخصتی کا گیت اس کے دل کو تڑپا گیا، مگر وہ اپنے جذبوں کو انا کی دیوار میں چن چکی تھی۔ فوزیہ نے بڑی بہن کے سر پر سرخ دوپٹہ رکھنا چاہا، مگر وہ ایک دم سرخ انگارہ بن گئی۔ پھر خود فوزیہ سرخ جوڑے میں گٹھری بنی دور دیس چلی گئی اور وہ آنکھوں کے روزن سے اس موسم کو دیکھتی رہ گئی۔ ذمے داریوں کی پوری دیوار اس پر گر پڑی اور ماں اس کی صورت دیکھتی رہ گئی۔ پھر خزاں کے موسم آئے اور بہار کی رُت دور ویرانوں میں کھو گئی۔

اس وقت اس کی سرخ آنکھیں دیوار پر آویزاں کیلنڈر میں الجھی ہوئی ہیں اور اس کا ذہن کاغذ کے پرزوں کی مانند بکھر گیا ہے۔ آنکھوں کے کھلے دریچوں کے بیچ کیلنڈر والی عورت مسکرا رہی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے، مگر وہ تو گزرے موسموں کی راکھ بن گئی ہے۔ کمرے کا دروازہ ابھی تک بند ہے۔ ڈبل بیڈ پر دو تکیے اداس پڑے سرد ہو چکے ہیں اور گدے کی ساری گرمی لحاف نے پی لی ہے اور اس کا وجود احساس کی نرم و ملائم روئی میں لپٹا گرمی کی پیاس کو ترس رہا ہے اور اس کے جسم کا فراز بیتے لمحوں کا دکھ سہتے سہتے نشیب سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ پت جھڑ نے درختوں سے حیا چھین لی ہے اور شاخیں ننھی کونپلوں کے لیے ترس رہی ہیں۔ نرم قطروں کے وجود سے خالی زمین تپتے ہوئے جزیرے کی مانند بگولوں کی زد پر ہے۔

اس نے ذہن کے سارے دریدہ پیراہن نوچ پھینکے۔ پھر وہ خود کیلنڈر بن گئی۔ اس کے وجود کے گرد آندھیوں کا شور تھا۔ بہت سی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اب وہ ہر آواز کا جواب دینا چاہتی تھی۔ اس نے انا کی دیوار کی ایک ایک اینٹ کو اکھیڑ ڈالا تھا۔ گھر کے بوجھ

سے وہ تنگ آچکی تھی۔ اب وہ ہر آواز کو اپنے سینے میں دفن کر لینا چاہتی تھی، مگر آوازوں کی گونج دور دور تک پھیل گئی تھی اور کوئی آواز صاف سنائی نہ دے رہی تھی۔ اس کے کانوں میں ناموں کے بہت سے لفظ گونجے، پھر جانے کہاں کھو گئے.... اور وہ ترستی رہ گئی۔ وہ ٹوٹتے ٹوٹتے، کٹتے کٹتے بس اتنی رہ گئی تھی جیسے سمندروں کے بیچ چھوٹا سا ویران جزیرہ.... بے آب و گیاہ۔

منڈیروں سے ڈھلتی دھوپ کا نوحہ روح کے سارے تار جھنجھوڑ رہا تھا۔ اجاڑ موسموں کی پاگل ہوائیں تیز ہو گئی تھیں۔ درختوں سے پتوں کے لباس چھن گئے تھے اور وہ اپنے حُسن سے محروم ہو گئے تھے کہ درختوں کا حسن پھول پتوں سے ہے۔ پھر وہ آسمان کی طرف نگاہ کیے اپنے وجود کی سسکیوں میں کھو گئی۔ بند دروازے کھل گئے تھے۔ نرم دھوپ دیوار سے اتر کر زمیں بوس ہو رہی تھی۔ اس کی ساری گداختگی ختم ہو چکی تھی اور مرسلہ کا وجود جانے اور کتنے وجودوں کے ساتھ ڈھلتی دھوپ کے نوحے میں شامل ہو چکا تھا۔

(افکار کراچی۔ ۱۹۸۰ء)

درد کی بازگشت

بات ہی کچھ ایسی تھی کہ جس نے بھی سنا، دم بخود رہ گیا۔

اتنے کرب انگیز واقعے کا یوں اچانک رونما ہو جانا، اچنبھے سے کم نہ تھا۔ یوں تو آئے دن ایسے واقعات ہو رہے تھے جو انسانی ضمیر پر بوجھ بنتے جارہے تھے، مگر شدت کے اعتبار سے یہ اپنی نوعیت کا منفرد واقعہ تھا جس کی گھن گرج دور تک سنی گئی۔ اس نے دلوں کی اس آگ کو شعلہ بنا دیا جس کی انہیں کل سے زیادہ آج ضرورت تھی۔

اس کے ذہن پر اس واقعے کا اتنا شدید اثر تھا کہ وہ تمام رات نہ سو سکا۔ یکے بعد دیگرے وہ تمام واقعات اس کے ذہن میں تازہ ہوتے گئے جو پچھلے کئی ماہ سے وادی میں رونما ہو رہے تھے اور جن کی شدت نے کاروبارِ زندگی کو معطل کر دیا تھا۔

رات کا مہیب سناٹا دل میں خوف کے نئے دریچے کھول رہا تھا۔ کہر آلود وادی کا اداس چاند سلسلۂ کوہ کی سب سے بلند چوٹی پر ٹھہر سا گیا تھا۔ آسمان پر مٹیالے بادلوں کی بے ربط قطار آہستہ آہستہ ان دیکھی منزلوں کی جانب رواں تھی۔ ایسے میں چاند کی دھندلی روشنی نے وادی کی فضا کو اور بھی پر اسرار بنا دیا تھا۔ یخ بستہ ہواؤں کی زد پر دور کھڑے ہوئے چیڑ، دیودار، چنار اور سفیدے کے تناور درختوں کے ہیولے ان کہی داستانوں کے امین لگ رہے تھے۔ وادی ظلم کا چپا چپا ہر روز ایک نئی داستان کے ورق الٹتا۔

صادق لحاف اوڑھے، کھلی کھڑکی کے باہر کے تمام منظر کو آنکھوں میں اتارتا رہا۔ وہ گاہے گاہے گولیوں کی آواز اور فوجیوں کے بوٹوں کی چاپ سے چونک پڑتا اور اس کے ہاتھ سرہانے رکھی ہوئی بندوق کی طرف بے اختیار بڑھ جاتے۔ کبھی کبھی گاؤں کے کسی گھر سے ایک دم شور بلند ہوتا۔ نوجوانوں کو بے تحاشا مارنے پیٹنے، گھروں سے گھسیٹ کر باہر نکالنے، الھڑ دوشیزاؤں کو

زبردستی فوجی گاڑیوں میں ٹھونسنے، ان کے بوڑھے ماں باپ کی مزاحمت پر انہیں گولیوں کا نشانہ بنانے، شیر خوار بچوں کو ماؤں کی گود سے چھین کر نیزوں کی انی پر اچھالنے یا انہیں زندہ گہری کھائیوں میں پھینک دینے کے لرزہ خیز واقعات، صادقے کو پاگل کئے دے رہے تھے اور وہ انتقامی جذبات کی بھڑکتی ہوئی بھٹی میں یوں تپ رہا تھا گویا اس کا بس چلے تو وہ ظلم کی اس کائنات کو آن کی آن میں جلا کر خاکستر بنا دے۔ اس نے جوں ہی غصے میں کروٹ بدلی، کھڑکی پر ایک سایہ سا نمودار ہوا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا اور لحاف کو ایک طرف پھینکتے ہوئے بندوق پر لپکا، مگر فوراً ہی سرگوشی کے سے انداز میں کسی نے اس کا نام لے کر مخاطب کیا،

"صادقے!....." "کون؟...."

"میں ہوں.... رحیموں!...."

"کیا بات ہے؟...." بندوق پر اپنی گرفت کو مضبوط کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"جلدی باہر آ! خیر دین چاچا کے خاندان پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ ظالموں نے مائی رحمتے، ذکرو اور خود انہیں گولی مار دی ہے۔ شیرو فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے، مگر ظالموں نے نازلی زینب اور ریشماں کو قابو کر کے گاڑی میں ڈال لیا ہے اور وہ گل مہر کی جانب جاتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ شیرو، ہم سے آملا ہے۔ اس نے روتے ہوئے یہ سب کچھ بتایا ہے۔ جلدی کرو! تمام ساتھی تیرا انتظار کر رہے ہیں۔۔ ہم ان کا پیچھا کریں گے۔"

صادقے ہتھیار سے لیس ہو کر دوسرے کمرے میں گیا جہاں اس کی جوان بہن گلشن اور روزی بے خبر سو رہی تھیں۔ ماں بھی ایک طرف نیم خوابیدہ سی پڑی تھی۔ باپ چند ہفتے پہلے گولیوں کا رزق بن چکا تھا۔ اس نے گلشن کو آہستہ سے جگایا اور سرگوشی کے سے انداز میں سارا واقعہ بتایا اور ہوشیار رہنے کی تاکید کر کے باہر نکل گیا۔ گلشن حریت پسند خواتین دستے کی سالار تھی آزادی کی اس جنگ میں مردوں کے شانہ بشانہ عورتیں بھی لڑ رہی تھیں۔

ان کی جیپ گل مہر ٹرانزٹ کیمپ کی طرف جانے والے اس سنسان راستے پر چل پڑی جو اونچے اونچے پہاڑوں کے سرسبز دامن سے گذرتا ہوا مشرق کی جانب کیمپ کی پشت پر نکلتا تھا۔ قابض فوجیوں نے آبادی سے دور اس علاقے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کئی عارضی کیمپ قائم کر رکھے تھے۔ اس کے جنوب میں ہندوؤں کی آبادی تھی شمال میں ایک خوبصورت جھیل بہتی تھی اور مغرب کی جانب پرانے انداز کا بنا ہوا خوبصورت ڈاک بنگلا تھا جو ڈوگرہ راج کی یاد دلاتا تھا

جس میں غیر ملکی سیاح آج بھی آکر ٹھہرتے اور وادی کی سدا بہار دوشیزگی سے لطف اندوز ہوتے، مگر ان دنوں یہ ڈاک بنگلا فوجی افسروں کے استعمال میں تھا جہاں وہ دشمن فوج کے درندوں کی معیت میں انتقامی جذبے اور شراب کے نشے میں سرشار ہو کر روزانہ وادی کی خوبصورت لڑکیوں کی دوشیزگی سے دل بہلایا کرتے اور مزاحمت پر طرح طرح کے تشدد اور انسانیت سوز مظالم ان پر ڈھاتے۔ اسی بنگلے سے ملحق چند سرونٹ کوارٹرز تھے جن کو عقوبت خانوں اور ان کی مخصوص زبان میں "منگل استھان" کے طور پر استعمال کیا جاتا۔ ان عقوبت خانوں کے لئے چند کمرے مخصوص تھے جو تنگ و تاریک ہونے کے علاوہ نہایت غلیظ اور بدبودار تھے۔ انہیں کے ساتھ کچھ اور خالی کمرے تھے، جن میں سپاہی اور درندہ صفت انسان زبردستی چاند ستارہ جیسی بے داغ دوشیزاؤں کی عصمت لوٹا کرتے۔ ہر رات ان کی چیخ و پکار کی لرزہ خیز آوازیں پاگلوں کی طرح دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر مدد مانگتیں، مگر دوسرے کمروں میں محبوس باپ بھائیوں کے کان ان نیم وحشی ننگی آوازوں کو سن سن کر بہرے ہو چکے تھے۔ وہ مظالم سے چور اس قابل نہیں تھے کہ دیواروں کو توڑ کر ان کی آبرو بچا سکتے، البتہ ان میں سے کچھ ایسے ضرور تھے جو ان دلدوز چیخوں کی تاب نہ لا کر دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر لہولہان اور ادھ موئے ہو چکے تھے۔ گلشن نے "منگل استھان" کے چند واقعات، جو اس نے اپنی ان سہیلیوں سے جو اس دردناک تجربے سے گذر چکی تھیں، سن رکھے تھے اور جو اس وقت صادقے کے جانے کے بعد ریشماں کے متعلق سوچتے ہوئے اسے پوری شدت سے یاد آرہے تھے اور وہ ان سارے واقعات کے بارے میں سوچ کر انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔

جب وہ گل مہر کے ڈاک بنگلے کے قریب پہنچے تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ کم عمر نازلی اور نوخیز زینب نیم مردہ حالت میں "منگل استھان" کے باہر خون میں لت پت پڑی تھیں۔ صادقے بھاگ کر جب ان کے قریب پہنچا تو وہ کراہتے ہوئے بس اتنا کہہ سکیں، "چار درندے!....." اور ان کی آواز گل مہر کا ابدی کرب بن کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ اتنے میں اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ ایک گولی صادقے کی کنپٹی سے ہو کر گذر گئی اور وہ فوراً زمین پر لیٹ گیا اور اس کے دیگر ساتھی جیپ چھوڑ کر جھاڑیوں میں چھپ کر جوابی فائرنگ کرنے لگے۔ انہیں بے رحم بارود کی آوازوں کے درمیان کراہنے اور چیخنے کی ایک اور توانا آواز بھی بار بار ابھر رہی تھی، مگر تھوڑی ہی دیر بعد آواز کمزور پڑ کر وادی کی صدائے بازگشت بن گئی۔ شیرو اور صادقے کے کان

کبھی اس کھنک دار آواز سے مانوس تھے، مگر اس وقت وہ کتنے بے بس دکھائی دے رہے تھے!
صادق ریشماں کی ڈوبتی ہوئی آواز سن کر تڑپ اٹھا۔ وہ اس کی منگیتر اور گاؤں کی آبرو تھی۔ وہ غصے سے پاگل ہوا جارہا تھا۔ اس نے نہایت بے بسی کے عالم میں ڈاک بنگلے اور "منگل استھان" پر اندھا دھند فائرنگ شروع کردی۔ دوسری طرف سے بھی جوابی فائرنگ دوبارہ ہونے لگی۔ پھر انہیں محسوس ہوا کہ وہ گھیرے میں آگئے ہیں، مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور بے جگری سے لڑتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کے تمام ساتھی زخمی حالت میں گرفتار ہوگئے، البتہ صادق اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ اداس چاند گہرے سرمئی بادلوں کی اوٹ میں منہ چھپائے انسان کے ہاتھوں انسان پر ظلم ہونے کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وادی میں چاروں طرف ملگجا اندھیرا پھیل رہا تھا، مگر اس اندھیرے میں دبی دبی سی دھندلی روشنی بھی سموئی ہوئی تھی جیسے شبنم کے ننھے قطروں کے ساتھ لگ کر تاروں کی تھوڑی تھوڑی سی روشنی اتر آئی ہو۔ یخ بستہ خشک ہواؤں کا ہلکا سا بے نام شور دیوزاد درختوں کے درمیان سے ابھر کر نئے وسوسوں کو جنم دے رہا تھا۔ ایسے میں صادق کے دل میں آج پہلی بار ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چاند سے اپنے دل کا درد بیان کرکے اتنا روئے، اتنا روئے کو وہ بھی جبر کی تمام حد بندیوں کو توڑ کر اس کا غمگسار بن جائے۔ پھر وہ اس سے کہے کہ وہ خاموش تماشائی بنی ہوئی ساری دنیا کو وادی کے اس ظلم کی داستان سنا دے کہ شاید امن کے پجاریوں اور انسانی حقوق کے بلند و بانگ دعویداروں کے کانوں تک ان کی چیخ پکار نہیں پہنچ رہی ہے۔

صادق زخموں سے چور گرتا پڑتا جب گھر کی دہلیز پر پہنچا تو کوئی بھی اس کو سنبھالا دینے کے لئے باہر نہ آیا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سانس درست کرتے ہوئے گلشن کو آواز دی، مگر آواز نامراد لوٹ آئی۔ دروازہ کھلا تھا اور اندر گہری خاموشی تھی۔ وہ بدحواسی کے عالم میں کمرے کی طرف بھاگا۔ وہاں اس نے عجیب منظر دیکھا۔ ماں خون میں لت پت زمین پر پڑی تھی۔ چودہ سالہ بہن روزی آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ اس کے گورے بے داغ جسم پر تشدد کے نشان تھے، سفید چادر خون آلود تھی۔ اس کے چہرے اور جسم کے دیگر نازک حصوں کو سگریٹ سے داغا گیا تھا اور وہ انتہائی کرب کے عالم میں تڑپ رہی تھی۔ وہ گلشن کی تلاش میں دوسرے کمرے میں گیا اور وہاں اسے دو درندوں کی لاشیں پڑی ہوئی ملیں جو یقیناً گلشن کی گولیوں کا نشانہ بنے تھے۔ وہ لوٹ کر

روزی کی طرف آیا کہ شاید وہ کچھ بتا سکے، مگر وہ بہت دور جا چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گلشن کو کہاں تلاش کرے۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا کہ کہیں ریشماں کی طرح وہ گلشن کو بھی نہ اٹھا لے گئے ہوں، مگر وہ کس سے پوچھے، کہا جائے۔ کرفیو کی وجہ سے ہر طرف خاموشی تھی۔ وہ کس طرح بچ کر واپس پہنچ سکا تھا، خود اسے بھی حیرانی ہو رہی تھی۔

صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ وہ تھک ہار کر گھر کی دہلیز پر بیٹھا آزادی کی بھینٹ چڑھ جانے والوں کے لئے آنسو بہا رہا تھا۔ اس کا گھر لٹ چکا تھا۔ وہ دنیا میں سارے عذاب جھیلنے کے لئے تنہا رہ گیا تھا۔ اسے رہ رہ کر گلشن کا خیال آتا۔ بار بار اس کا ذہن گل مہر کے بنگلے کی طرف جاتا شاید گلشن کو وہ درندے آزادی کی جنگ لڑنے اور ان کے سینکڑوں ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کی پاداش میں عقوبت خانے نہ لے گئے ہوں۔ کہیں ریشماں کی طرح اس پر بھی تشدد نہ ہوا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو وہ گاؤں والوں کو کیا منہ دکھائے گا۔ لوگ کہیں گے کہ بہن کی حفاظت بھی نہ کر سکا۔ وہ بہن جو اس کا دست و بازو اور تحریکِ آزادی کی مونس و ہمراز تھی۔

کرفیو میں وقفہ ہوتے ہی لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس سانحے پر سب افسوس کر رہے تھے اور اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ گلشن کے اچانک چلے جانے کا سب کو دکھ تھا۔ عورتیں اور اس کی ساتھی نوجوان مجاہد لڑکیاں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں، اس کی جرأت مندی اور بے خوفی کے تذکرے ہو رہے تھے جسے سن کر ان میں آزادی کی خاطر قربان ہونے کا نیا عزم پیدا ہو رہا تھا۔ جوشیلی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا، مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی گمشدگی کی اس خبر کو وادی کے دوسرے علاقوں تک کیسے پہنچائیں۔ اخبارات کی اشاعت پر پابندی تھی۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی۔ کے دروازے آزادی چاہنے والوں کے لئے بند کر دیئے گئے تھے۔ تھانے میں اس گمشدگی کا اندراج مشکل تھا۔ آخر وہ کیا کریں۔ اسے کہاں ڈھونڈیں۔ عالمی ضمیر پر بے حسی طاری ہے۔ ہمارے نام نہاد نجات دہندوؤں نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ ہماری آزادی کا سودا کیا اور ہمیں حق خود ارادیت سے محروم کیا۔ آج ہمارے دلوں سے ان کے لئے بد دعائیں نکلتی ہیں۔ سب پاگل پن کے عالم میں بے سرو پا باتیں کر رہے تھے۔ صادق خاموشی سے ان باتوں کو اپنے دل کی گہرائیوں میں اتار رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ریشماں پر پڑی۔ وہ زندہ تھی، مگر اپنی بربادی پر نوحہ کناں، غم سے نڈھال، نظریں جھکائے ہجوم کا حصہ بنی، ایک طرف دور کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے صادق کا وجود ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوا، مگر اس میں

اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اس کا اظہار کر پاتا۔ بس آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے چمک پیدا ہوئی پھر ماند پڑ گئی۔

مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اس ظلم اور بربریت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جارہی تھی، عدم تشدد کے اصولوں کی مالا جپنے والوں کے مردہ ضمیر کو جھنجھوڑا جارہا تھا۔ وادی کے گوشے گوشے میں آزادی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی۔ لوگ غم و غصے سے پاگل ہوئے جارہے تھے۔ بچے کھچے غیر ملکی نامہ نگار کبھی کبھار وادی میں پھیلی ہوئی اس بربریت کی کچھ خبریں چوری چھپے اپنے ملکوں کو کسی نہ کسی طرح بھیج دیا کرتے۔ حالات اتنے سنگین تھے کہ اس خطے میں مدد کے لئے کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ غاصبوں نے جبر کی انتہا کر دی تھی، مگر ان کے حوصلے میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی تھی۔ صادقے نے بھی سب کچھ برداشت کر لیا۔ ریشماں اور اس کا دکھ سانجھے کا دکھ بن گیا تھا جسے وہ تقدیر کا لکھا سمجھ کر سہار گئے۔

شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ کرفیو روز کا معمول بن گیا تھا جس کے دوران وہ گھروں میں بند کر دیئے جاتے۔ زندگی ان پر تنگ کی جارہی تھی جس کا موسم بڑھ رہا تھا، مگر دلوں کے جذبے زندہ اور صادق تھے۔ وہ کرفیو کے دوران اپنے اپنے گھروں میں ریڈیو کے گرد جمع ہو کر وادی کے دوسرے علاقوں میں جاری حریت پسندوں کی جہدِ آزادی کی خبریں سنتے اور ان کی کامیابی پر بیحد خوش ہوتے۔ کرفیو کی خلاف ورزی کی خبریں ان میں نیا ولولہ پیدا کر دیتیں اور وہ ہتھیار لے کر اکثر گھروں سے باہر نکل جاتے۔ ان کے لئے عالمی رابطے کا واحد ذریعہ بیرونی خبر رساں ایجنسیاں تھیں یا مقامی آزاد ریڈیو اسٹیشن جن کے ذریعے مختلف علاقوں میں ہونے والی جد و جہدِ آزادی کی خبریں ان تک پہنچتیں اور مختلف ممالک کی حمایت پر ان کے حوصلے بلند ہوتے اور تازہ ترین صورتحال سے باخبر ہو کر وہ نئے منصوبے بناتے۔

ایسی ہی ایک رات ایک بیرونی خبر رساں ایجنسی سے بہت ہی عجیب و غریب خبر نشر ہوئی جسے سن کر وہ دم بخود رہ گئے۔ خبر کچھ یوں تھی:

"مقبوضہ وادی کی ایک اٹھارہ سالہ دوشیزہ نے اپنی جان کی قربانی دے کر وادی کے آزاد حصے کے نوجوانوں کے نام یہ پیغام دیا ہے کہ آخر ہماری مدد اور عصمتوں کی حفاظت کے لئے کب آؤ گے؟"

دریائے جہلم سے ملنے والی اس دوشیزہ کی لاش کے گلے سے بندھا ہوا ایک خط ملا ہے،

جس میں اس نے لکھا ہے کہ میرے پاس آزاد وادی کے نوجوانوں تک پیغام بھیجنے کا ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ میں خط میں اپنے جذبات لکھ کر اپنے گلے میں لپٹے ہوئے دوپٹے میں باندھ کر دریا میں کود پڑوں اور میری لاش آزاد وادی کے باشندوں تک پہنچ جائے۔ پھر وہ میرے اس پیغام کو آزادی چاہنے والے تمام لوگوں تک پہنچا دیں۔

اس نے خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ اب تک ہزاروں دوشیزاؤں کی عزت و ناموس وادی کے درندوں کے ہاتھوں تار تار ہو چکی ہے اور ہر رات کمسن بچیاں بھی اس درندگی کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں۔ دنیا کا ضمیر بھی اس سفاکی پر خاموش تماشائی بنا ہوا ہے۔ اگر لوگ اپنی بہنوں اور معصوم بیٹیوں کی مدد کو نہ پہنچے تو قہر الٰہی سے کوئی بھی نہ بچ سکے گا۔ اس خبر کو سن کر صادقہ کو ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے گلشن کو آزادی مل گئی ہو اور اس نے دنیا کی تمام مظلوم اقوام کو آزادی کی نوید سنا دی ہو، مگر پھر دوسرے ہی لمحے ایک اور خیال نے اس کے پورے وجود میں جھرجھری سی بھر دی، گویا حقوقِ انسانی کی بات کرنے والوں کے منہ پر اس نے ایک زوردار طمانچہ مار دیا ہو جس کی ضرب کی آواز سے وہ جی اٹھا ہو۔

(سیارہ۔ لاہور۔ ۱۹۹۳ء)

وہ شجر تھا موسم درد کا

اس روز ، زندگی میں پہلی بار میں ایک عجیب سی کیفیت سے دو چار ہوا - خط پڑھتے پڑھتے میرے خیالوں کا سلسلہ یکبارگی ٹوٹ گیا اور یوں محسوس ہوا گویا ایک غیر مرئی سی قوت مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہو - بات کچھ ایسی حیرانی کی تو نہ تھی ، مگر پھر بھی دل بے اختیار ہوا جا رہا تھا - میں ہوسٹل کے کمرے میں تنہا تھا اور میرا روم میٹ اپنے گاؤں گیا ہوا تھا -

ہوسٹل کے باہر چاروں طرف وسیع و عریض میدان تھا جس میں برفیلی ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں - اندر کمرے میں ، ہیٹر جل رہا تھا جس نے کمرے کو اتنا گرم کر دیا تھا کہ لحاف کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی - باہر اتنی شدید ٹھنڈک تھی کہ کوشش کے باوجود کمرے سے نکلنے کو جی نہ چاہ رہا تھا ، مگر اندر کی تنہا اداسی کو خط کی تحریر نے اس قدر کرب انگیز کر دیا تھا کہ باہر کا شور سننے کو دل تڑپ اٹھا تھا - ایسے میں گہری خاموشی سے ابھرتی ہوئی اس سریلی آواز نے دل و دماغ کو اتنا ہپناٹائز کر دیا کہ میں نہ چاہنے کے باوجود بے اختیار ہو کر گرم شال اوڑھے کمرے سے باہر نکلا ، تالا بند کیا اور تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اترتا اس آواز کی سمت دیوانہ وار چل پڑا جو وسیع میدان کے عین درمیان سے آ رہی تھی - میں اکیلا تھا اور رات انتہائی سرد و تاریک !

میدان میں قدم رکھتے ہی مجھے ایک لمحے کو بڑی شدت سے احساس ہوا جیسے میرے اندر کوئی چیز ادھوری رہ گئی ہو جس کی تکمیل نہ ہوئی تو شاید میں بھی ادھورا رہ جاؤں گا یا پھر.... ؟ گہری تاریکی میں قدم بڑھاتے ہی یخ بستہ ہواؤں کے تیز جھونکے نے میرے وجود کو جیسے دو نیم سا کر دیا - مجھ پر کپکپی سی طاری ہو گئی ، مگر میرے قدم پھر بھی نہ رکے - تھوڑی دور جا کر میں ایک لمحے کو ٹھٹکا گھور اندھیرے میں راستہ بھی نظر نہ آ رہا تھا - میدان میں چاروں طرف لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی اور ہر ڈھلان کے بعد ایک وسیع میدان آتا تھا - اس طرح یکے بعد دیگرے کئی میدان تھے جن مو ،

ہر طرف بس اندھیرا ہی اندھیرا تھا جس نے زمین و آسمان کے درمیان کے خلا کو پُر کر دیا تھا۔ میرے پاؤں اس خوفناک اندھیرے میں دھنستے چلے جا رہے تھے۔ پھر اندازے سے اس سمت کا تعین کیا، جدھر سے یہ آواز سرد ہواؤں کے دوش پر تیرتی ہوئی آرہی تھی۔ تیز تیز قدم بڑھاتا، اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا، میں اس وجود کے قریب پہنچ گیا جو اپنی دھن میں مگن نے نوازی میں مصروف تھا اور اپنے دل کا درد سمیٹے پوری وادی کو رلا رہا تھا۔ ایسی درد بھری آواز میں نے زندگی میں کبھی نہ سنی تھی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ نہ جانے کیسے اس نے میری موجودگی کو محسوس کر لیا اور رک کر پوچھا،

"کون ہے؟"

"میں ہوں! یہیں ہوسٹل میں رہتا ہوں۔" میں نے آواز سن کر اسے پہچان لیا تھا۔ یہ مستان تھا جو اکثر ہوسٹل کی کینٹین میں نے بجایا کرتا تھا اور لوگ اسے مستان کہہ کر پکارتے تھے۔

"اچھا! اس وقت آپ یہاں!" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں! تمہاری آواز کا جادو مجھے یہاں لے آیا۔"

"بہت خوب نے بجاتے ہو۔ تمہاری نے نوازی سے تو سناٹے بھی بولنے لگے ہیں۔ ہر طرف آواز ہی آواز ہے اور پھر غزل بھی فیض کی۔

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

کیا صاف بول سمجھ میں آرہے ہیں!.... اور دھن بھی شاید تم نے اپنی بنائی ہے۔

"بس بابو! کبھی کبھی رونے کو جی چاہتا ہے، سو رو لیتا ہوں۔ میرے لئے کیا دن اور کیا رات۔ میری تو دنیا ہی تاریک ہے۔ میں تو اندھیرے کا اس قدر عادی ہو چکا ہوں کہ مجھے اندھیرے دن کی طرح روشن لگتے ہیں۔" مستان روہانسی آواز میں سب کچھ کہہ گیا اور اٹھ کر غلط سمت کی طرف جانے لگا۔ میں نے ٹوکا،

"ادھر کہاں جا رہے ہو؟ کیا آنسوؤں کی دھند ابھی تک دور نہیں ہوئی؟"

"نہیں بابو! یہ بات نہیں بلکہ راستے بھی مجھ سے روٹھ گئے ہیں۔

اس نے اندھیرے میں کچھ ٹٹولتے ہوئے کہا۔

تب مجھے احساس ہوا کہ وہ تو بینائی سے محروم ہے اور اپنی سفید چھڑی ڈھونڈ رہا ہے۔

میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور میں درد کی شدت سے لرز گیا۔

"یہ رہی چھڑی!" میں نے اسے چھڑی تھماتے ہوئے کہا۔

"بابو جی! یہ راستے اس چھڑی کے بغیر بھی مجھے اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ میں ان پر آج تک نہیں بھٹکا.... کبھی نہیں چوٹ کھائی۔"

یہ دوسری حیرت تھی جس نے میرے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیا اور میرے سامنے تجسس کا ایک نیا باب کھل گیا۔ وہ بڑے اعتماد سے بیناؤں کی طرح آفیسرز ہوسٹل کی طرف جانے والی سڑک پر ہو لیا۔ پھر بائیں مڑ کر کچھ دور چلنے کے بعد دائیں مڑا اور اس سڑک پر ہو لیا جو ٹی اینڈ ٹی کالونی کے اندر سے ہو کر ہری پور شہر کی طرف جاتی ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"تمہاری باتیں بڑی دلچسپ اور عجیب ہیں مستان! کچھ دیر اور بیٹھتے!"

"نہیں بابو! رات کافی ہو گئی ہے۔ گھر پر انتظار ہو گا۔ کل پھر آؤں گا۔"

میں اسے خدا حافظ کہہ کر واپس کمرے میں آگیا۔ میرے وجود سے لپٹی ہوئی تنہائی میرے ساتھ تھی۔

اس رات میں بالکل نہ سو سکا۔ میرا ذہن، مستان کی ان کہی داستان میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ جانے کیا دکھ تھا جسے اس نے اپنی گرم چادر میں چھپا رکھا تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں رہتا ہو گا۔ اس کی دیکھ ریکھ کون کرتا ہو گا۔ آخر کون سا ایسا درد ہے جو وہ ان وادیوں کو سنانے آتا ہے۔ میں تمام رات اسی ادھیڑ بن میں کروٹیں بدلتا رہا اور سونے کی بے سود کوشش میں میرا ذہن خط کی اس تحریر میں الجھ گیا تھا جو کراچی سے آیا تھا اور جس میں میری بیوی نے اپنی تنہائی کا سارا درد بھر دیا تھا۔ وہ سب کے ہوتے ہوئے بھی اکیلی تھی.... برسوں سے اکیلی۔ میں بھی یہاں اکیلا، وادی کے سناٹے بھی اکیلے اور بوڑھا چاند، جو اب قریب کے پہاڑ کی اوٹ سے آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا، بالکل اکیلا تھا اور یخ بستہ ہواؤں میں ٹھٹھرا ہوا بند کھڑکی کے شیشے سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی جانب نظریں جمائے سوچ رہا ہوں.... میرے اندر کوئی چیز ادھوری رہ گئی ہے جیسے، ہم دونوں کے وجود ہوتے ہوئے بھی نامکمل۔

دوسرے روز پھر وادی کے خوابیدہ درد جاگ اٹھے۔ وہ بڑے مسحور کن انداز میں نے نوازی کر رہا تھا جس کی دھن وادی کی وسعتوں میں پھیل کر اس گیت کا تاثر بکھیر رہی تھی جس کے بول کچھ یوں صاف سمجھ میں آرہے تھے:

دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے
ہم بھری دنیا میں تنہا رہ گئے

میرے دل میں گویا ہلچل سی مچ گئی تھی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میری ترجمانی کر رہا ہو۔ میں اس کے قریب کھڑا اس کے درد کو اپنے وجود میں سموتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس کی چھٹی حس نے میری موجودگی کو محسوس کر لیا۔

"آؤ بابو جی! کب سے کھڑے ہو؟"

میں گرم شال اوڑھے خاموشی سے شبنمی گھاس پر بیٹھ گیا۔ پھر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا،

"تم نے رات مجھے سونے نہیں دیا۔"

"کیوں بابو! کیا ہو گیا تھا؟"

"بس تمہارے جانے کے بعد نیند نہیں آئی اور تمہارے ہی بارے میں سوچتا رہا۔"

"میں نے آپ کو دکھ دیا.... معاف کر دیں!"

"نہیں کوئی بات نہیں! دراصل میرا درد بھی جاگ اٹھا تھا۔"

"میں برسوں سے یہاں نے بجاتا ہوں مختلف شہروں سے ٹریننگ کے لئے لوگ آتے ہیں سب نے مجھے سنا، مگر کسی نے میرے درد کو نہیں جانا۔ آپ شاید پہلے آدمی ہیں، جس نے میرے وجود کی محرومی کے درد کو اپنے دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور شاید تڑپ اٹھے۔ میں سمجھتا ہوں مجھ سے زیادہ گہرا گھاؤ آپ کے دل میں ہے۔"

"ہاں!.... شاید۔" میں بے اختیار بول پڑا۔

"جبھی تو چاہتا ہوں کہ تمہارے دکھ.... میں لے لوں۔"

"نہیں بابو! کون کس کا درد سمیٹتا ہے۔ آج تو باپ، بیٹے کا.... بھائی، بھائی کا.... بیوی، شوہر کا اور بہن.... بہن کا دکھ نہیں بانٹتی.... آپ تو پھر بھی غیر ہو۔ زمانہ کیسا آ گیا ہے! سب کچھ بدل رہا ہے.... درد اور رشتے۔ آدمی، آدمی کی پہچان بھول گیا ہے۔"

"تم ٹھیک ہی تو کہتے ہو۔"

"اب دیکھو نا بابو! یہاں مختلف علاقوں کے لوگ ٹریننگ پر آتے ہیں.... اور مجھ سے نے نوازی کی فرمائش کر کے گانا سنتے ہیں پھر انعام اور بخشش دیتے ہیں، حالانکہ میں کچھ مانگتا نہیں،

مگر ساتھ ہی یہ بھی پوچھتے ہیں کہ میں کس علاقے کا رہنے والا ہوں۔ جب میں چپ رہتا ہوں تو خود ہی کہنے لگتے ہیں کہ! میں فلاں علاقے کا رہنے والا ہوں۔ بھلا وہ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہم سب ایک ہی ملک کے رہنے والے ہیں، ہماری پہچان کیا صرف "علاقہ" ہے؟ مجھے یہ سن کر دکھ ہوتا ہے اور میں اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ شکر ہے آپ نے یہ سوال نہیں کیا۔"

"میں یہ سوال کیوں کرتا؟ ہم سب انسان ہیں اور بس۔ ہم کسی جغرافیائی حد بندی پر یقین نہیں رکھتے۔ ہمارے رشتے درد کے رشتے ہیں۔"

"ہاں! شاید.... آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں، مگر بابو! دکھ تو یہ ہے کہ لوگوں نے اپنے آپ کو علاقوں میں بانٹ کر نفرتوں کی دیواریں کھڑی کرلی ہیں۔"

"خیر چھوڑو! تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔ آخر تمہیں کیا دکھ ہے اور تمہاری بینائی؟...."

وہ بڑی خاموشی سے میری باتوں کو سن رہا تھا۔ پھر بولا،

"غالباً ۱۹۷۵ء کی بات ہے۔ میرے والد کا بس کے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ میں اس وقت اٹھارہ برس کا تھا اور ہری پور فرٹیلائزر فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ ماں میری پیدائش کے وقت ہی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کر سکا۔ چچا گل خان کے حالات ایسے نہ تھے کہ وہ مجھے آگے تعلیم دلواتے۔ ملازمت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ابھی ملازمت کو چند ہی ماہ ہوئے تھے کہ میں شدید بیمار پڑ گیا۔ مجھے چیچک نکل آئی تھی۔ اس ظالم بیماری کی وجہ سے میری بینائی جاتی رہی۔ پھر جب ٹھیک ہوا تو ملازمت نہ رہی.... دنیا میں کوئی اور نہ تھا۔ کچھ کھیت تھے جو میں نے چاچا گل خان کے سپرد کر دیئے۔ ان کی سمجھ میں جو آتا ہے، وہ اناج غلے کی شکل میں ہر سال، ہر فصل پر مجھے دے دیتے ہیں جس سے گزارہ ہو جاتا ہے۔ میں دن بھر کھیتوں کی روش یا درختوں کے سائے تلے بیٹھا کچھ سوچتا رہتا ہوں اور کوئی کام تو ہے نہیں۔"

"کیا اور کس کے بارے میں سوچتے ہو؟" میں نے ٹوکا۔

"بس ہے کوئی آپ جان کر کیا کریں گے؟ دکھ ہوگا۔"

"پھر بھی! کچھ تو بتاؤ.... شاید میں تمہارے لئے کچھ کر سکوں۔"

"میرے بابا نے میری شادی چاچا گل خان کی بیٹی ریشم سے طے کر دی تھی۔ وہ پنڈی سے شادی کا سامان لے کر واپس آ رہے تھے کہ ہری پور کے قریب خطرناک موڑ کاٹتے ہوئے بس ہزاروں فٹ گہرے کھڈ میں گر گئی اور بابا میری شادی کا ارمان لئے وقت کی تاریکیوں میں اتر گیا

اور میری شادی نہیں ہوئی۔"

"کیا.... چاچا گل خان نے انکار کر دیا؟"

"نہیں! ایسی بات نہیں۔"

"پھر!"

"میں نے ہی انکار کر دیا۔"

"تو گویا تم نے ریشم کا معصوم دل توڑ دیا آخر کیوں؟"

"بس میں ڈر گیا۔ میرے دل میں انجانے خوف کے اندھیرے سما گئے۔ میں اس اندھیرے میں اس کے مستقبل کی روشنی کو اسیر کرنا نہیں چاہتا۔"

"ریشم کی شادی ہو گئی؟"

"اس نے بھی انکار کر دیا ہے۔ کہ وہ کسی سے شادی نہیں کرے گی۔"

"تم نے اس کی وجہ پوچھی؟"

"ہاں! ایک بار اسے سمجھاتے ہوئے پوچھا تھا۔"

"پھر؟"

"وہ کہتی ہے کہ تجھی سے شادی کروں گی، ورنہ گہرے کھڈ میں کود جاؤں گی۔ کیسی.... دیوانی ہے.... کبھی کبھی میں اس کی ضد پر ہنستا ہوں.... اتنا کہ ہنستے ہنستے رونے لگتا ہوں اور روتے روتے سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں.... سارے دکھ.... تمام غم.... بلکہ اپنے آپ کو بھی۔ تب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری دونوں آنکھیں روشن ہو گئی ہیں اور میں ریشم کو دیکھ رہا ہوں.... اس کی خوبصورت آنکھیں رو رہی ہیں.... اس کا سراپا رو رہا ہے۔ پھر وہ مجسم انتظار بن کر میری ڈھارس بندھاتی ہے۔ میں سوچتا ہوں.... میں اسے کیا دے سکوں گا۔ خوشیاں تو اپنے پاس ہیں نہیں اور شاید دنیا میں بھی ناپید ہو گئی ہیں.... رہ گئے غم.... وہ تو اس کے پاس بھی بہت ہیں.... اور کس کے پاس غم کی کمی ہے!" وہ بڑے بھولپن سے یہ سب کچھ کہے جا رہا تھا اور مجھے دل ہی دل میں اس کی باتوں پر ہنسی آ رہی تھی۔ پھر میں نے اسے چھیڑنے اور کریدنے کے خیال سے کہا،

"اس کے پاس دکھ کیوں ہونے لگے۔ اس نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے؟"

"نہیں بابو! ایسا نہیں ہے۔ دکھ ہیں اس کے پاس.... بہت سارے۔ ہم غریبوں کا یہی تو ایک سرمایہ ہے جو کبھی کم نہیں ہوتا.... اور پھر دنیا تو میں نے بھی نہیں دیکھی۔ میں نے تو ابھی

کراچی تک نہیں دیکھا۔"

"اچھا بتاؤ! کیا دکھ ہے اسے.... بس تمہارے ہی نہ ہونے کا دکھ ہوگا؟"

"یہ بات نہیں! اصل بات یہ ہے کہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا، اپنی ماں کو روتے دیکھا، حالانکہ اس کی ماں کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے.... گل چاچا ہے.... کھیت ہیں.... گھر ہے.... خود ریشم ہے اور میں ہوں.... نہیں ہے تو زمان.... اس کا اکلوتا بیٹا۔"

"کیا وہ خدانخواستہ؟...."

"نہیں.... نہیں! یہ بات نہیں۔ وہ زندہ ہے، مگر شادی کرنے کے بعد اس نے ماں باپ کو چھوڑ دیا اور کراچی میں جا کر آباد ہو گیا۔ کبھی ملنے بھی نہیں آتا.... عید بقرعید پر بھی نہیں۔ چاچی اس کے لئے بہت روتی ہے.... بلک بلک کر.... اولاد ہے نا!.... چاچا اسے سمجھاتا ہے۔ اکثر اس پر غصہ بھی کرتا ہے۔ چاچی کے آنسو وہ دیکھ نہیں سکتا۔ وہ بھی روتا ہے.... خشک آنکھوں سے.... دل ہی دل میں.... چپکے چپکے.... پہاڑوں کی اوٹ میں جا کر.... سفیدے کے تنے سے لپٹ کر.... آلوچے کے درختوں کے جھنڈ میں گردن نہوڑا کر.... روتا ہے.... بیٹے کے لئے.... بہت روتا ہے، مگر دنیا کو دکھائے بغیر.... مرد ہے نا! اور پھر کیوں نہیں روئے گا، بڑھاپے کا کوئی سہارا نہیں۔ ایک میں تھا، سو قدرت نے میری آنکھوں میں بھی اندھیرا بھر دیا.... غریب کے مقدر کا اندھیرا۔ اولاد، اسی لئے تو ہوتی ہے کہ بڑھاپے کا سہارا بنے، مگر آج کی اولاد.... خدا کی پناہ!" جذبات کی آندھیوں سے لڑتے لڑتے وہ تھک سا گیا تھا۔

"ایسا نہ کہو مستان! سب کی اولاد تو ایسی نہیں ہوتی۔"

"ہوتی ہے بابو! سب کی ہوتی ہے اور غریب کی تو خاص کر ہوتی ہے۔ زمانہ بڑا خراب آ گیا ہے.... اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جیسے رو کر خدا سے شکایت کر رہا ہو.... اس کی مخلوق کی شکایت۔"

"اچھا! تمہاری اولاد ہو گی تو پوچھوں گا۔" میں نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

وہ ایک لمحے کے لئے ساکت رہا پھر اندھیرے میں گھورتے ہوئے کہنے لگا،

"ابھی کل ہی کی بات ہے۔ میں نے تنہائی میں ریشم کو چھیڑتے ہوئے کہا تھا،

"میں تم سے جلد ہی شادی کر رہا ہوں۔ میں اب تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ ہمارے بہت سارے بچے ہوں، وہ ہم کو تنگ کریں، روئیں، ہنسیں،

چیختے ہوئے دوڑیں بھاگیں، شرارتیں کریں۔ کوئی میرا سہارا بنے اور کوئی چاچا کا۔ چاچی بھی ان کے ساتھ بہلی رہے، زمان کا دکھ بھول جائے اور آنگن ان کے شور سے گونجتا رہے۔ وہ بڑے غور سے میری باتیں سنتی رہی۔ ایک لفظ نہ بولی۔ کئی لمحے خاموش گذر گئے۔ میری حیرانی بڑھی۔ میں نے ٹٹولنے کے سے انداز میں ادھر ادھر ہاتھ گھمائے۔ مجھے شک ہو رہا تھا۔ شاید وہ موجود نہیں ہے۔" وہ مسلسل بولے جا رہا تھا۔ میں اس کی باتیں سن رہا تھا، مگر وہاں موجود نہ تھا۔ میں خیالوں میں گم سوچ رہا تھا.... میرے اندر کوئی چیز ادھوری رہ گئی ہے جس کی تکمیل نہ ہوئی تو شاید میں بھی ادھورا رہ جاؤں۔ خط کی اس تحریر کی طرح جس میں جذبے ادھورے رہ گئے ہوں اور تنہائی کے سناٹے دل میں خوف کے اندھیرے بھر رہے ہوں۔ معاً مجھے بہت سارے بچوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کوئی رو رہا تھا.... کوئی چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا رہا تھا۔ ان کی بھاگ دوڑ اور لایعنی حرکتوں سے ذہن بوجھل ہوا جا رہا تھا۔ مگر مجھے کوفت بالکل نہیں ہو رہی تھی۔

"ریشم! تو شادی سے خوش نہیں ہو گی کیا؟" اس نے زور سے کہا اور۔ میں ایک دم سے چونک پڑا۔

"نہیں.... بالکل نہیں!" وہ چپ کی دنیا سے ایک دم بول پڑی۔

"کیوں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"بس ہے کوئی بات۔"

"نہیں۔ نہیں.... تو ایسا نہ سوچ! سب کی اولاد زمان کی طرح تو نہیں ہو سکتی.... اور پھر دنیا میں عورت کی سب سے بڑی خواہش اولاد ہی ہوتی ہے۔ وہ اپنے ادھورے وجود کو مستحکم کرنے کے لئے ماں بننا چاہتی ہے اور تو....؟"

"ہاں.... ہاں! مجھے پتا ہے، جبھی تو میں نے بڑے دکھ کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں ماں کے آنسو نہیں دیکھ سکتی۔"

اور پھر شادی کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی ریشم کی گود ہری ہو گئی۔ اس کی ماں بہت خوش تھی۔ اس نے بیٹے زمان کا دکھ بھلا دیا تھا۔ چاچا گل خاں بھی نئی فصل کی طرح لہلہا اٹھا تھا اور مستان بھی دل ہی دل میں مسکرا کر امید کی فصل بونے لگا تھا۔ وادی میں ہر طرف نرم ہواؤں کے سرد جھونکے چلنے لگے تھے۔ آلوچوں کے درختوں پر پھول کھل اٹھے تھے جس کی مہک سے وادی کا گوشہ گوشہ معطر ہو گیا تھا۔

پھر ایک رات ریشم ماں بن گئی۔ گھر میں خوشیاں ناچنے لگیں۔ محلے پڑوس میں خبر پھیل گئی کہ مستان ایک بیٹے کا باپ بن گیا ہے۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے کی طرح اس کے ہونٹ متواتر ہل رہے تھے جیسے وہ دل ہی دل میں اپنی آنکھوں کی روشنی کے لئے خدا سے، دعا مانگ رہا ہو..... بس ایک لمحے کی روشنی کے لئے تاکہ وہ اپنے نوزائیدہ بچے کو دیکھ سکے۔

صبح کے نمودار ہوتے ہی سب سے پہلے ریشم نے بچے کو سینے سے لگایا، پیار کیا۔ وہ بالکل باپ پر گیا تھا۔ چاچی اس کی ایک ایک چیز کی تعریفیں کر رہی تھی۔ گھر خوشیوں سے بھر گیا تھا۔ سب اپنا غم بھول گئے تھے۔ وقت گذرتا رہا۔ وہ بڑا چونچال اور ہونہار تھا۔ پھر وہ آنگن میں کھیلنے لگا۔ مستان چارپائی پر بیٹھا اسے کھلاتا رہتا۔ وہ کہتا کہ اب اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ اس کی انگلی پکڑ کر پورے محلے اور بازار کی سیر کرائے گا، چاچا کے ساتھ کھیتوں پر جائے گا، گاؤں کے بچوں کے ساتھ کھیلے گا۔ وہ اس کے لئے بازار سے گیند اور بلا لے آئے گا۔ وہ ایک اچھا کھلاڑی بنے گا۔ اس کا نام روشن کرے گا۔ ملک کے کام آئے گا۔ جانے کتنی معصوم خواہشیں اس کے دل میں موجزن تھیں۔

وہ ہر وقت بچے کو اپنے پاس رکھتا۔ ایک روز چاچا اس کے لئے بازار سے گیند لے آیا اور چارپائی پر کھیلتے ہوئے اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ اسی طرح گیند سے بے پروا منہ میں انگلی ڈالے زور زور سے آواز نکال کر کھیلتا رہا۔ سب کو حیرانی ہوئی۔ پھر چاچی نے گیند اس کے ہاتھوں میں پکڑا دیا۔ اس نے گیند کو منہ میں ڈالنا چاہا کہ وہ ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ اس نے گیند کو بالکل نہ دیکھا کہ وہ کس طرف گرا ہے.... اور کھیلتا رہا۔ سب کو پریشانی ہوئی کہ آخر وہ گیند کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتا۔ کیا اسے نظر نہیں آرہا ہے یا کوئی اور بات ہے۔ ماں نے گود میں اٹھا کر اپنی انگلی اس کی آنکھوں کی طرف کی کہ وہ انگلی پکڑ لے، مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ ریشم کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے ماں کو مخاطب کر کے کہا،

"ماں! اسے تو شاید کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ ڈاکٹر کو بلاؤ!" پھر ڈاکٹر نے بڑے دکھ اور افسوس کے ساتھ مستان سے کہا،

"اس کی دونوں آنکھیں بے نور ہیں۔" اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ غم کی آندھیوں کی زد پر آکر پھلدار درخت کی مانند جڑ سے اکھڑ کر زمین پر گر پڑا ہو۔

(افکار کراچی۔ ۱۹۹۴ء)

کھلی آنکھوں کے خواب

جب سے اسے مائیگرین کا درد شروع ہوا تھا، وہ دفتر سے گھر آکر کچھ دیر سو جاتا۔ کام کی زیادتی، شہر کے روز بروز بگڑتے ہوئے حالات، نوجوانوں کے سیاسی قتل و خون کی لرزہ خیز خبریں، ماؤں کی آئے دن گود اجڑنے اور سہاگنوں کے بے سبب سہاگ لٹنے کی درد ناک داستانوں کو سن کر وہ ذہنی دباؤ میں رہنے لگا تھا۔ اخبار پڑھنا اس نے تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ بس کبھی کبھار بس اسٹاپ پر انتظار کی گھڑیاں کاٹنے کے لیے کھوکھے پر رکھے ہوئے مختلف اخبارات کی سرخیاں سرسری طور پر دیکھ لیتا اور سنسنی خیز خبروں کو پڑھ کر اس کا دورانِ خون بڑھ جاتا۔ اکثر اس کی نظریں اخباروں کی سرخیوں پر ہوتیں، مگر اس کے کان اخبار فروش چاچا رحمت کی ہجو ملیح میں ڈوبی ہوئی باتوں کو، جو وہ کسی کو مخاطب کیے بغیر اپنے آپ بولے چلے جاتے، مسلسل سنتے رہتے، جنھیں وہ مسکرا کر ذہن میں اتار لیتا اور ایک عجیب بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا۔

شہر میں قتل و غارتگری کا بازار گرم تھا اور خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی دن میں یا سرِ شام گھر سے باہر نہ نکلتا۔ آپس کا ملنا جلنا، تقریبات میں شریک ہونا، حتیٰ کہ اپنوں کی میت کو کاندھا دینا، تعزیت اور پرسے کو جانا، سب کچھ موقوف ہو گیا تھا۔ قیدِ حیات اور بند و غم اصل میں دونوں ایک ہو گئے تھے۔ سب پر یہی عذاب ٹوٹ پڑا تھا۔ بس وہ دفتر سے سیدھے گھر آتا اور کپڑے تبدیل کر کے کوئی کتاب یا رسالہ لے کر بستر پر دراز ہو جاتا اور چند ہی منٹ میں تکان کے سبب اس کی آنکھ لگ جاتی۔ زندگی کتنی بے بس اور محدود ہو کر رہ گئی تھی!..... آزادی کی قید ہو جیسے۔

آج جب وہ سو کر اٹھا تو شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ کمرے میں اندھیرے یوں پھیل گئے تھے، گویا پوری رات ہو گئی ہو۔ وہ اکیلا تھا۔ بیوی میکے گئی ہوئی تھی۔ گھر میں اکیلے پن کا اداس سناٹا اور دل میں زہر بھری تنہائیاں تھیں۔ ذہن بوجھل بوجھل سا تھا اور درد کی شدت میں

کمی نہ آئی تھی ۔ وہ بستر پر گم صم بیٹھا رہا ۔ اس کے ذہن میں اب تک خواب کے منظر ڈوبتے ، ابھرتے رہے ۔ عجیب بے تکا سا خواب تھا ، جس کی یاد اس کے ذہن میں ابھی تک محفوظ تھی ، حالانکہ اس سے پہلے اکثر ایسا ہوتا کہ آنکھ کھلنے کے کچھ ہی دیر بعد وہ خواب کی ساری باتیں بھول جاتا .... بس کبھی کبھار تھوڑی دیر تک کبھی ڈر ، خوف یا کبھی خواب کے حسین منظر کا ہلکا سا سرور چھایا رہتا ۔ مگر آج .... اتنے میں خاور آگیا ۔ اس نے پوچھا ،

"کیوں اتنے گم صم ہو ؟"

"یار ! ایک خواب دیکھا ہے ۔"

"رومانٹک رہا ہو گا ۔"

"ہاں کچھ کچھ !"

"پھر تو خوش ہونا چاہیے ۔ بھابھی کی کمی خواب میں پوری ہو گئی ہو گی شاید ۔" دونوں نہایت بے تکلف دوست تھے ۔ زندگی کے سارے معاملات میں ایک دوسرے کے ہمراز و دمساز .... بلکہ تمام سربستہ رازوں کے لیے ایک دوسرے کی نظر میں بے پیرہن و بے لباس ۔

"کیا دیکھا ؟" خاور نے دلچسپی لیتے ہوئے کریدا ۔

"میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا دو کمروں کا مکان ہے ، جس کے ایک کمرے میں بینائی سے معذور ایک بوڑھا چارپائی پر لیٹا سو رہا ہے ۔ اس کے سرہانے ایک بوڑھی عورت تنگ سی جگہ میں مصلا بچھائے نماز پڑھ رہی ہے اور اس کے پیچھے ذرا فاصلے پر کھڑی تازہ جوانی سے بھرپور ایک لڑکی اس جانب دیکھ رہی ہے ، جہاں دوسرے کمرے میں دیوار کی اوٹ سے لگا میں کپڑے تبدیل کر رہا ہوں ۔ اس کی موجودگی سے بے خبر میں نے پہلے شلوار اتاری اور پائنچے کو پیروں سے نکالنے سے قبل جیسے ہی دونوں ہاتھوں کو آڑا ترچھا کر کے قمیض اتارنے کے لیے دامن پکڑنا چاہا کہ اچانک مجھے احساس ہوا گویا کوئی کن انکھیوں سے مسکرا کر میری طرف دیکھ رہا ہو ۔ میں نے فوراً جھک کر دوبارہ شلوار پہن لینا چاہا کہ اتنے میں ، ہنس کر اس نے چہرہ دوسری طرف کر لیا ۔ میرے ذہن کا منظر ایک دم سے بدل گیا ۔ رگوں میں خون کی حدت بڑھ گئی ۔ مجھے یاد آیا ، اس کہانی میں ایک ایسی ہی عورت کا ذکر تھا ، جو مختلف مردوں کے سائے تلے زندگی گزارنے کی عادی ہو گئی تھی ۔ ہر بار تجربے کار مرد اس کا شکار ہوتے اور وہ نئے نئے تجربے سے دوچار ہوتی ۔ ادھیڑ عمر کا شکار پھانسنا اس کی "ہابی" تھی ۔ اس نے نہ شادی کی تھی اور نہ ارادہ تھا .... ملازمت کرتی اور ایسے ہی ایک چھوٹے

سے کچے علاقے کے مکان میں تنہا رہتی ۔ اس نے اپنے آپ کو بڑے جتن سے سنبھال کر رکھا تھا۔ اس کے گدرائے ہوئے وجود میں جوانی کی چاندنی چٹکی رہتی ۔ آغاز میں ایسے ہی بیباک منظروں نے اسے بھی ذہنی اعتبار سے پختہ بنا دیا تھا اور وہ ایک جستجو میں الجھی رہنے لگی تھی ۔

"پھر کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"میں غسلخانے میں نہانے چلا گیا ۔ پھر جب میں نہا کر ننگے بدن نکلا تو وہ دیکھ رہی تھی ۔ میں نے بھی اس کی طرف دیکھا، وہ شرما کر دوسری طرف دیکھنے لگی ۔ بوڑھی عورت دعا مانگنے میں مصروف تھی ۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے ۔ وہ کہہ رہی تھی،

"اے اللہ! سب کو اپنی امان میں رکھنا۔ میرے بیٹے کو تمام شہید ہونے والے بیٹوں کے ساتھ جنت میں جگہ دینا ۔ مجھ بے سہارا کا وہ واحد سہارا تھا۔ اس معصوم کا کسی گروہ سے بھی کوئی تعلق نہ تھا، بس وہ جوان تھا، جس کی سزا اسے دی گئی ....جو تیری مرضی ۔"

پھر اس نے مڑ کر بیٹی کی طرف یوں دیکھا، جیسے اس کے امان میں رہنے کی بھی دل ہی دل میں دعا مانگ رہی ہو،

"مگر خاور! یہ عجیب بات ہے کہ میں نے اس کے چہرے کو صاف نہیں دیکھا۔ خواب میں اس کا سراپا تو نظر آیا، مگر چہرہ غائب تھا۔ میرے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ سب خواب لگتا ہے۔" میں نے خاور سے پوچھا،

"تم نے ایسا کوئی خواب کبھی دیکھا؟"

"خواب تو نہیں، مگر خواب ہی جیسا ایک واقعہ آج ہی سنا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"یہی کہ وہ کسی کا ٹیلیفون لگوانے کے سلسلے میں ایک فلیٹ کی آٹھویں منزل پر گیا ۔ بل بجائی ۔ ایک خاتون نے دروازہ کھولا ۔ اندر لے گئیں ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کا اشارہ کر کے دوسرے کمرے میں کچھ لینے چلی گئیں ۔ وہ بیٹھ کر اس کمرے کا جائزہ لینے لگا ۔ سامنے کی دیوار پر منقش قالین کے ایک بڑے سے ٹکڑے پر خوبصورت منظر کے درمیان دو گھوڑے ایک دوسرے کو کاٹنے کے سے انداز میں اپنے بہیمانہ جذبے کا اظہار کر رہے تھے ۔ اس منظر کے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک خوبرو نیم برہنہ عورت کی پینٹنگ کچھ اس زاویے سے آویزاں کی گئی تھی گویا وہ انھیں دیکھ رہی ہو ۔ اس کے تھکے ہوئے ذہن کا منظر بدل رہا تھا۔ وہ اس منظر میں وقتی طور

پر کھو سا گیا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟" وہ بتا رہا تھا،

"میری بچی کی شادی ہونے والی تھی۔ مجھے پیسوں کی سخت ضرورت تھی، جبھی تو ٹیلیفون کے ہائرنگ کانٹرکٹ پر دستخط کروانے اور ایڈوانس پیسہ لینے میں اس عورت کے پاس گیا تھا۔ اتنے میں شربت کا گلاس لیے وہ خاتون نمودار ہوئیں۔ ان کی آنکھوں میں عجیب چمک تھی۔ اس کے بالکل قریب جھک کر گلاس میز پر رکھتے ہوئے بولیں،

"شربت پیجیے!" ان کے گریبان سے خوشبو کا ایک تیز جھونکا رہائی پا کر اس کے نتھنوں میں مقید ہو گیا۔ وہ سراپا معطر تھیں اور اس کے پہلو میں بیٹھی اسے گھور رہی تھیں۔ وہ گھونٹ گھونٹ شربت حلق سے اتارتا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ بات کیسے شروع کی جائے۔ اس نے بے ارادہ شوکیس کے اوپر رکھی ہوئی ایک مرد کی تصویر کی طرف غور سے دیکھا،

"یہ میرے شوہر کی تصویر ہے۔" اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس نے کہا اور وہیں سے ایک البم اٹھا کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے البم دکھانے لگی،

"یہ میری شادی کی تصویر ہے، جب میں دلھن بنی ہوئی تھی، اور یہ ہنی مون کے وقت کی تصویر ہے، اور یہ .... اور یہ .... وہ ورق الٹتی رہی .... عجیب عجیب زاویے سے لی گئی تصویریں .... بیباک انداز، شوخ ادائیں .... اس کے اپنے ذہن میں کئی البم کھل گئے تھے۔ اسے کچھ یاد آنے لگا تھا اور وہ سوچ رہا تھا، پہلی ملاقات .... اتنی بے تکلفی، پہلے سے نہ جان، نہ پہچان .... پھر جانے کیا ہوا کہ گلاس اس کے ہاتھ کی لرزش سے کانپ اٹھا،

"ارے! کیا ہوا؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں! بس ٹھیک ہی ہے۔" اس نے دستخط کے لیے کاغذ اس کی طرف بڑھایا کہ اتنے میں اچانک فلیٹ کے نیچے سے بے تحاشا گولیوں کے چلنے کی آواز آنے لگی۔ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور قریب ہی بیٹھی ہوئی وہ عورت سہم کر اس سے چمٹ گئی۔

"ڈریے نہیں! ہم تو بہت اوپر ہیں۔ دروازہ بند ہے۔ گولی یہاں نہیں آئے گی۔"

"نہیں .... نہیں! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ لو، جیسے میرے شوہر اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیا کرتے تھے، مگر انھیں گولیوں نے ان کو مجھ سے جدا کر دیا۔ ان سے مجھے خوف آ رہا ہے، کہیں یہ مجھے بھی .... " وہ پوری قوت سے اس کے وجود میں سما رہی تھی اور وہ

بدحواس ہو کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گولیوں کی آواز قریب سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، جیسے کوئی دروازے کے قریب آگیا ہو۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بیڈروم میں لے گئی اور جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ وہ عجیب دنیا میں تھا۔ آن کی آن میں ایک ایسا بھیانک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا، جس کے لیے وہ بالکل تیار نہ تھا۔ اس کی خود سپردگی اور وارفتگی .... وہ جان چھڑانے میں مصروف تھا۔ وقت گویا ٹھہر سا گیا تھا۔ اس کے خیالوں میں پہلے اس کی بیوی اور چار بچے آئے، جوان بیٹی کا تصور ابھرا، جس کی شادی کے لیے وہ دوڑ بھاگ کر رہا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے ایک غلطی دوسری بیوی کی شکل میں ایک بچہ لیے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ ڈر گیا۔ وہ کسی اور حسین خواب کی گرفت میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ باہر گولیاں چلتی رہیں اور وہ اپنے شوہر کو یاد کرتی رہی۔ اس نے بڑی اپنائیت سے کہا،

"میں پھر آؤں گا۔ آج میں جلدی میں ہوں۔"

"پھر کب؟ آج کیوں نہیں؟" طوفان تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کئی منٹ تک وہ بے بس رہا۔

پھر ذہن کا منظر آہستہ آہستہ بدلنے لگا، جیسے اس کا وجود خواب سے برآمد ہو رہا ہو۔ اس نے کاغذ پر دستخط تو کر دیے، مگر پیسے نہیں دیے، جس کی اسے شدید ضرورت تھی اور اگلی ملاقات کا وعدہ لے کر ٹال دیا۔ وہ اس کے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی لے کر الٹے پاؤں بھاگا اور سیدھا اس شخص کے پاس آیا، جس نے اسے یہ کام دلوایا تھا۔ سارا ماجرا سننے کے بعد وہ شخص زور سے ہنسا اور کہنے لگا،

"وہ ایک فرسٹیٹڈ عورت ہے۔ اس کے شوہر کو انھیں حالیہ ہنگاموں میں قتل کر دیا گیا۔ شوہر نے اس کے لیے کئی فلیٹ اور کافی جائیداد چھوڑی ہے۔ روپے پیسے کی کمی نہیں۔ وہ خود ڈاکٹر ہے۔ تھوڑے ہی عرصے پہلے وہ اس شہر میں آئی ہے۔ دراصل شوہر جیسی محبت اسے کسی مرد سے نہیں ملی۔ ایک جستجو اس کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ دنیا میں اور کوئی نہیں۔ وہ دولت کے سہارے تکمیل تمنا کا خواب ڈھونڈ رہی ہے اور تم نے ...."

"تو گویا تم بھی!"

"ہاں! میں بھی۔"

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"خیر چھوڑو! تم اس کا کام کر دو۔ پیسے مل جائیں گے۔"

"عجیب واقعہ ہے! یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا تھا، مگر وہ شناختی کارڈ؟" وہ خیالوں میں گم ہو کر کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا، جیسے پھر خواب دیکھ رہا ہو۔ اس نے دیکھا، پڑوس میں ایک لڑکی کی شادی ہوئی تھی۔ گھر کی دیواریں ملی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کھلی تھی اور پردے، ہلکی ہوا سے، بل رہے تھے۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور پیار بھری باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ رات کے پچھلے پہر کے سناٹے جاگ رہے تھے اور ہوا آواز کو کانوں تک پہنچا رہی تھی۔ درد جاگ اٹھے تھے۔ وہ کھڑکی پر بیٹھی سب کچھ کان لگا کر سن رہی تھی اور اداس چاند کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے وجود میں درد کی چاندنی اتر آئی تھی۔ نوبہتا جوڑے کی ہنسی فضا میں رس گھول رہی تھی اور اس کے ذہن میں اس وقت تجسس کا ایک جہاں آباد تھا۔ اس کی بھی شادی ہونے والی تھی۔ ماں بے خبر سو رہی تھی پھر اسے ایسا لگا جیسے سب کچھ ادھر نہیں، اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو۔ بے پیرہن وجود کو کن انکھیوں سے دیکھ کر اس کے اندر جو بھونچال آیا تھا، اس کے ضبط کا اس میں یارانہ تھا۔ رات خاموش تھی۔ وہ آہستہ سے اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ وہ بھی اپنے اندر کا دکھ بیان کرنا چاہتا تھا، مگر یہ دیکھ کر ٹھٹھک گیا کہ وہ چاند پر نظریں جمائے رو رہی تھی۔ اس نے ہلکے سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونک کر سمٹ گئی۔

"کیا ہوا؟ کچھ بتاؤ!" وہ اس کے پہلو میں بیٹھ گیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کے شانے کو پھر ایک بار ہلایا۔ وہ خواب سے چونک پڑی۔ اس کا وجود تپ رہا تھا۔ کہنے لگی،

"وہ یاد آگیا تھا، جس کو پچھلے دنوں بیگناہی کی سزا میں قتل کر دیا گیا۔ ابھی ہماری شادی ہونے کو چند ہی دن تو باقی رہ گئے تھے۔" اتنے میں ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ کھڑکی سے جو آواز ابھری، اس میں ہلکی سی لذت آفریں کراہ بھی شامل تھی۔ دونوں نے اس آواز کو سنا، ہلکی سی جھرجھری لی اور اسے اپنے وجود کا حصہ بنالیا۔ آنکھوں سے ڈھلتے ہوئے موتی چاندنی میں چمکے اور رخساروں پر آکر ٹھہر گئے۔ اس کے ذہن میں بہت سی کھڑکیاں کھل گئی تھیں۔ وہ دلجوئی کے چند الفاظ کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ اتنے میں اچانک بوٹوں کی آواز سے گلی جاگ اٹھی۔ وہ سہم کر بے اختیار اس کے وجود میں سما گئی اور دونوں نے خوف کی چادر اوڑھ لی۔ دوسرے گھر کی کھڑکی کی راہ سے آنے والی دلربا آوازیں چشم زدن میں بین میں بدل گئیں۔ شوہر کو گھسیٹ کر بیوی سے جدا کیا

جارہا تھا۔ بیوی چیخ رہی تھی۔ اس کا کسی سے کوئی واسطہ نہیں، مگر اس کی آواز کو صرف رات نے سنا اور پھر وہ، ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ یہ دونوں سہم کر چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس نے کہا،

"شاید، ہم محاصرے میں ہیں۔ دروازہ نہ کھولنا!" مگر دوسرے ہی لمحے ایک زوردار ضرب سے دروازہ خود بخود کھل گیا۔ وہ چارپائی کے نیچے دم بخود بیٹھا اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ وہ لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے اور پوچھ رہے تھے،

"تیرا "وہ" کہاں ہے سالا؟ کدھر چھپا دیا؟"

بوڑھے ماں باپ بیدار ہو کر کچھ کہنا ہی چاہ رہے تھے کہ اتنے میں تڑ تڑ کی آواز نے انھیں خاموش کر دیا اور خوف و دہشت سے اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ سوچنے لگا، یہ کیسا خواب تھا؟ ہم کس کی تلاش میں سرگرداں ہیں؟

افکار کراچی، ۱۹۹۶ء

آنکھ کا عذاب

میری آنکھیں گم ہو گئی ہیں .... میں کہاں تلاش کروں .... ؟ میری اس بے بسی کا کسی کو احساس نہیں ....! شاید ہر شخص بے بصارت ہو کر بے یقینی اور بے سمتی کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ عجب دور آگیا ہے! بھرے پرے شہر کے راستے سنسان اور ویران ہیں۔ کبھی کبھی کسی گاڑی یا موٹر سائیکل کی بے تکی آواز میرے کانوں سے ٹکرا کر گذر جاتی ہے۔ ایک لمحے کو میرے پورے وجود میں شور بھر جاتا ہے۔ میں ٹھٹھک کر سوچنے لگتا ہوں .... زندگی تو ہے، مگر میں کدھر جاؤں۔ فیصلے کی گھڑی آنے سے پہلے ہی اچانک میرے بالکل قریب کسی گاڑی کی زور دار بریک مجھے آدھے راستے پر روک لیتی ہے اور میں بے توازن ہو کر گر پڑتا ہوں ....

" دیکھ کر نہیں چل سکتے ....! " ایک چیخ میرے کلیجے کو اندر سے چھلنی کر دیتی ہے۔ میں سنبھل کر اٹھتا ہوں، پھر سڑک پار کر کے آگے کی طرف بے سمت چل پڑتا ہوں۔ میری کوئی منزل نہیں .... میری آنکھیں گم ہو گئی ہیں۔ مجھے کسی نے شاید نہیں دیکھا، گویا سب کی بصارت کھو گئی ہو۔ بہت قریب سے آوازیں آ رہی ہیں .... شاید میدان میں بچے کھیل رہے ہیں۔ ان کی آوازیں اچھی لگ رہی ہیں۔ شاید اس ہما ہمی میں کسی کی نظر پڑ جائے اور وہ مل جائیں .... مگر نہیں ....!

میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ جاتا ہوں۔ تیز دھوپ کا عذاب سر پر ہے، " اوزون " کی تہیں پھٹ گئی ہیں، سورج سوا نیزے پر آ کر گویا قیامت ڈھا رہا ہے۔ اطراف میں پھیلے ہوئے دکھ کی شدت کا یہ عالم ہے جیسے جوان بیٹوں کو ان کے ماں باپ کی نظروں کے سامنے ذبح کیا جا رہا ہو اور آنکھیں گم ہو گئی ہوں۔ کیسا عذاب ہے، خدایا! .... کیسا عذاب؟ آنسوؤں کے جگنو اندھیری سیاہ رات میں چمک کر گم ہو رہے ہیں، بے سمتی اور بے بسی جن کا مقدر ہے۔

مسلسل تیز دھوپ میں چلتے رہنے سے میں پسینے میں شرابور ہو گیا ہوں۔ میرے اندر ایک اداسی بیٹھی ہوئی ہے۔ میں کس حوصلے سے آگے بڑھوں۔ میری آنکھیں گم ہو گئی ہیں۔ سارا شہر اسی عذاب میں مبتلا ہے۔ نہ اندر کا سہارا ہے اور نہ باہر کا.... پھر جینا....؟

گھنے درختوں کے پتوں سے ٹکرا کر ہوا کا شور ابھر رہا ہے۔ مجھے یاد آیا، ایک بار میں کسی عزیز کی میت کو دفنانے قبرستان گیا تھا۔ میری آنکھیں سلامت تھیں۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ قبرستان میں اس کی اپنی اداسی بھرا خوف پھیلا ہوا تھا۔ سیاہی کی چادر اوڑھے نیم، ببول اور برگد کے گھنے درختوں کے پتوں سے جب یکبارگی ہوا کا کوئی بے ربط جھونکا ٹکراتا تو جسم میں انجانے خوف کی جھرجھری بھر جاتی اور عاقبت کے اندیشے دل میں اترنے لگتے۔ بڑا اداس، رلا دینے والا منظر تھا.... جیسے شہر کا منظر ہو.... اپنے شہر کا۔ ان دنوں ایسی ہی اداسی اور بیچارگی تو شہر پر بھی چھائی ہوئی ہے اور قبرستان آباد لگ رہے ہیں۔ دن میں کئی کئی بار اور پھر سرِ شام سے لے کر رات گئے تک لوگوں کو یہاں آنا پڑتا ہے۔ سروں کی فصلیں کٹ رہی ہیں اور مٹی کے حوالے کر کے ناموں کے یادگار کتبے لگائے جا رہے ہیں۔ چپ کا موسم ہے اور لوگوں کا جانے کیا کچھ گم ہو رہا ہے۔ میری تو آنکھیں گم ہو گئی ہیں۔ شاید کسی نے دیکھا ہو....؟ مگر بتاتا کوئی نہیں....! یہ شہر بے زبان ہے۔ پتا نہیں اس پر ایسا وقت کیوں آپڑا.... پہلے تو ایسا نہیں تھا۔

تیز دھوپ کے عذاب سے بچنے کے لیے میں اس درخت کے نیچے آگیا ہوں، جس پر چڑیوں کی چہکار گونج رہی ہے۔ اس اداس موسم میں بھی مجھے ان کی آواز اچھی لگ رہی ہے۔ میں گردن اوپر اٹھا کر ان کی چہکار میں کھو جاتا ہوں۔ اسی پر کئی اور پرندے اترتے محسوس ہوتے ہیں۔ چھوٹی چڑیاں، ان کے خوف سے کسی اور پناہ کی تلاش میں اڑ جاتی ہیں۔ درخت پر خاموشی پھیل گئی ہے۔ میں سوچنے لگتا ہوں، دربدری ان کا بھی مقدر ہے شاید.... پھر کچھ لڑکے وہاں آجاتے ہیں۔ وہ کسی حیرانی کا ذکر کر رہے ہیں۔ میں ان کی باتوں کو غور سے سننے کی کوشش کرتا ہوں.... حیرت بھری ایک آواز میرے کانوں سے ٹکراتی ہے....

"یہ تو آنکھیں ہیں.... کتنی بڑی بڑی ہیں....!" میں بیچین ہو کر ان کی طرف ٹامک ٹوئیاں مارتے بڑھنا چاہتا ہوں....

"قربانی کو تو کافی عرصہ گذر چکا ہے، پھر یہ آنکھیں....! شاید میری ہوں...." کوئی جواب نہیں آتا۔

"قربانی کا تو کوئی موسم نہیں ہوتا ....!" طنز میں ڈوبی ایک تیسری آواز ابھرتی ہے، شاید کوئی سیانا آگیا ہے ....! چپ کی چادر بدستور تنی رہتی ہے۔ اتنے میں اسی درخت پر کوؤں کی کائیں کائیں سنائی دیتی ہے اور پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کا شور بلند ہوتا ہے، شاید چیل یا گدھ بھی درخت پر اتر آئے ہیں۔ اچانک ایک خوف میرے دل پر دستک دیتا ہے....

"میری آنکھیں .... شاید ...."

"انھیں لکڑی سے نہ دباؤ ....! رونے لگیں گی ...." خاموشی قائم ہے۔

"آنکھوں میں آنسو کہاں سے آتے ہیں ....؟" انھیں کے درمیان سے کوئی سوال ابھرتا ہے

"پتا نہیں .... مگر یار! یہ کسی انسان کی بھی تو ہو سکتی ہیں ...."

"وہ کیسے ....؟"

"کیوں نہیں ....! اگر اتنی بڑی بڑی آنکھیں ....!"

"ہوتی ہیں، یار! ...." انھیں میں سے ایک جھٹ بول پڑتا ہے ....

"میری بہن نگو کی آنکھیں تو اس سے بھی بڑی بڑی ہیں۔"

"اچھا ....!" اور ہاں ایک روز میں نے شموں بھائی کو ان کی آنکھوں کی تعریف کرتے سنا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے ....

"تمھاری ان جھیل جیسی گہری خوبصورت آنکھوں میں اتر جانے کو جی چاہتا ہے ...." نگو باجی شرما گئی تھیں۔

"بھلا آنکھوں میں کوئی کیسے سما سکتا ہے!"

"پتا نہیں۔"

"اور کیا کہا تھا شموں بھائی نے ....!" پہلے نے کریدا۔

"مجھے یاد نہیں۔"

"بتاؤ نا، یار! .... اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ اب تم بچے تو ہو نہیں ...." پھر انھوں نے کمرہ بند کر لیا تھا۔ دونوں کی ابھی ابھی شادی ہوئی تھی۔ میں نے بند کمرے کے دروازے کی جھریوں میں سے جھانک کر دیکھا، تو وہ سچ مچ ان آنکھوں کو پیار کر رہے تھے۔ سب لڑکے ایک ساتھ ہنسنے لگے ....

" بے شرم کہیں کے ....! " میں ان کی باتوں کو سن کر مسکرا اٹھا۔ مجھے اس وقت کچھ یاد آنے لگا تھا، جیسے ذہن میں گزری ہوئی رت لوٹ آئی ہو .... یادوں کی پروائی چلنے لگی ہو، مگر پھر مجھے محسوس ہوا جیسے انھیں میری موجودگی کا احساس ہو گیا ہو! میرے دل میں بڑی شدید خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ کاش میں ان آنکھوں کو دیکھ سکتا! کہیں وہ میری ہی نہ ہوں .... کہیں وہ نگو جیسی .... یا پھر اسی کی .... ایک برا سا خیال آیا۔ میں نے ان سے پوچھا،

"یہ آنکھیں کیسی ہیں ....؟"

"آپ خود دیکھ لیں چشمہ اتار کر ...."

"میں ایسا نہیں کر سکتا، میری تو آنکھیں گم ہو گئی ہیں۔ میں انھیں کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں ....!"

"اچھا ....! " ایک ساتھ کئی آوازیں حیرت میں ڈوب کر ابھریں۔

"چلو، یارو! ...." میں تنہا رہ گیا اور سوچنے لگا ....

"کہیں وہ آنکھیں ساتھ نہ لے گئے ہوں؟ " میں انھیں پاگلوں کی طرح زمین پر ٹٹولنے لگا۔ ادھر ادھر ہاتھ مارے۔ زمین تو وہی تھی، اس کی مانوس سی دھول بھی وہی تھی .... اکثر جب تیز ہوا کے جھونکے میری آنکھوں میں جھونک دیا کرتے اور میں آنکھیں مل کر رو دیا کرتا۔ مگر مجھے وہ آنکھیں نہ ملیں .... جانے کہاں گم ہو گئی تھیں۔ میں اداس ہو کر سوچنے لگا، آج آنکھیں ہوتیں تو میں یہ سارا منظر دیکھ پاتا۔

وہاں سے اٹھ کر میں اندازے سے آبادی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس لمحے بھی میرے ذہن میں یہ خیال آرہا تھا کہ شاید آنکھوں والوں کے پاس بھی آنکھیں نہیں ہیں۔ اتنے میں اچانک گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں ٹھٹھک کر دیوار سے لگ گیا۔ کئی بھاری گاڑیاں گذر گئیں، جیسے وہ کسی کے تعاقب میں ہوں اور سارے شہر کو دیوار سے لگانے کے درپے۔ پھر دروازوں کے کھلنے اور دھاڑیں مار مار کر رونے اور چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

" دیکھو! محمود تڑپ رہا ہے۔ اس کو گولی لگی ہے۔ زمین پر اس کا تازہ خون بکھرا پڑا ہے۔ اس کی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کی موت پر سینہ کوبی کر رہی ہے۔"

" یہ تو ختم ہو گیا؟ " کسی نے بتایا .... گلی میں خلقت کا ہجوم بڑھ گیا اور ہجوم میں سے طرح طرح کی آوازیں بلند ہونے لگیں

"جوان لڑکوں کو مارتے ہوئے ان کی آنکھیں نہ پھوٹ گئیں .... غضب خدا کا! .... معصوم لڑکوں نے کیا قصور کیا ہے، ہمیں کس جرم کی سزا مل رہی ہے ....؟" کئی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہو گئیں۔ ان آوازوں کے بھنور میں ایک ذرا بلند آواز ابھری ....

"نسل کشی کی جا رہی ہے شاید؟ شام کے اخبارات پر پابندی لگ گئی ہے۔ وہ مرنے والوں کی تعداد بڑھا چڑھا کر لکھتے ہیں۔ یہ بات کسی کو پسند نہیں؟" سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اچانک گڑگڑاہٹ کی آواز گونجی۔ سب کی آنکھیں اس طرف متوجہ ہو گئیں۔ ہیلی کوپٹر کی نیچی پرواز سے شہر کے کچھ علاقوں کا سروے کیا جا رہا تھا .... کئی علاقوں میں دہشت گردوں کی تلاش جاری تھی۔

"آج اپنا ہی شہر گویا دشمن کا علاقہ بن گیا ہے۔" کسی نے کہا، مگر کسی نے نہ سنا۔

بھیدوں بھری خاموشی سے شہر کی فضا اسیر ہے اور میری آنکھیں گم ہو گئی ہیں۔ میں خیالوں ہی خیالوں میں بہت دور نکل گیا مگر آوازیں میرا تعاقب کرتی رہیں۔ اس وقت میرے کان میری آنکھ بن گئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا، جب شہر پر عفریت کے سائے نہیں تھے، تو ہر منظر کو اپنی آنکھوں میں اتار لیتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میں لوگوں کی باتیں کم سنتا .... صرف ان کی آنکھوں کو غور سے دیکھتا اور سب کچھ سمجھ جاتا۔ میں نے بھی کبھی کسی مقصد سے پیار کیا تھا، جس کی پاداش میں میری آنکھیں گم ہو گئیں کسی کو اس کا احساس ہے؟ کیسا وقت آگیا ہے! گھروں سے جوان بیٹے غائب ہو رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں سڑکوں پر مل رہی ہیں، مگر بے حسی کا پتھر، ہم نے سینوں پر رکھ لیا ہے کوئی انتظار سا لگتا ہے شاید!

مجھے یاد ہے، جب میرے پرکھوں نے اپنے تکلیف دہ اور رلا دینے والے سفر کی داستان سنائی تھی۔ اس وقت میں کم عمر تھا، مگر واقعات کی کربناکی کو محسوس کر کے میری آنکھیں رونے لگتیں۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا۔

"آپ نے یہ سفر کیوں اختیار کیا تھا؟ کیا وہاں کی زمین تنگ کر دی گئی تھی؟"

"نہیں! یہ بات بھی نہیں۔"

"تو پھر ....؟"

"تیرے آنے والے اچھے دنوں کے لیے، ہم نے ایسا کیا تھا اور اب۔؟" وہ کچھ نہ کہہ پاتے بس روئے چلے جاتے اور میں بس ان کے آنسوؤں کو دیکھتا رہ جاتا۔

پچھلے دنوں وہ بھی اپنوں کی گولیوں کا زرق بن گئے

"اپنی زمین سے بیوفائی کا صلہ تو ملنا ہی تھا۔ میں نے بھی لوگوں کی پیروی میں اپنے جوان جہان بیٹوں کو سلامتی کی خاطر دیارِ غیر روانہ کر دیا شاید وہاں کی زمین انھیں راس آجائے۔ وہاں تو سب غیر ہیں، یہاں تو سب اپنے ہیں، مگر شاید وہاں وہ تہمتِ سفر کے عذاب سے بچ رہیں۔"

پھر میں اپنی آنکھیں کیوں ڈھونڈ رہا ہوں۔ اب دیکھنے کے لیے کیا باقی رہ گیا ہے۔ زندگی سفر میں کٹ گئی، پھر بھی کچھ نہ ملا۔ نسلوں کی تباہی کا غم سہتے سہتے، ہم کہاں نکل آئے نہ کوئی شناخت، نہ کوئی حوالہ۔

اتنے میں بالکل قریب سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ میں سہم کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا ہوں۔ آہ و بکا سے پتا چلتا ہے کہ محلے کے کئی گھر ویران ہو چکے ہیں۔ کلمہ شہادت کی آواز کانوں میں پڑی تو لگا جوانوں کے لاشے اٹھ رہے ہیں، مگر آنسو کا ایک قطرہ بھی زمین پر شاید نہیں گرا۔ گھنٹوں یہ سلسلہ جاری رہا، مگر شاید کوئی بھی گھر سے باہر نہیں نکلا۔ خوف اور سناٹا ہر طرف پھیلا ہوا تھا اور گولیوں کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ پھر بڑی دیر بعد میں نے ڈرتے ڈرتے کانوں سے انگلیاں باہر نکالیں اور حیران رہ گیا۔ مجھے کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ میں چیخ مار کر زمین پر گر پڑا۔ آنکھوں کی تلاش میں میری سماعت بھی چلی گئی تھی۔

اگست ۱۹۹۶ء

زندگی کے ساز پر

آج بھی وہ ڈھاکے اسٹیشن پر نظر آئی - وہ اسی انداز سے کھڑی تھی - اس کے ہاتھ میں وہی بنگلہ رسالہ تھا جس کا سرورق بد احتیاطی کی نذر ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ وہی لڑ کا میلی سی لنگی اور دھاری دار قمیض پہنے تھا، جس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک تھیلا تھا - لگتا تھا جیسے وہ مارکیٹنگ سے واپس آ رہی ہو - میں اسے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا اور پیچھے کے خالی ڈبے میں داخل ہو کر کھڑکی کے پاس والی برتھ پر بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بھی آ گئی اور اس کے ہونٹوں پر وہی ایک سوال لرزنے لگا۔

"ایئے گاڑی کو تھائے جابے؟" (یہ گاڑی کہاں جائے گی؟) -

میں نے کوئی جواب دیئے بغیر اس کے چہرے کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور شرارتاً پوچھ بیٹھا،

"کینو؟" (کیوں؟) -

"بولتے کچھو اشو بھید آچھے؟" (بتانے میں کوئی حرج ہے؟) - اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"کنتو.... آپنی تو جانن -" (لیکن.... آپ تو جانتی ہیں) - میں نے ذرا نرمی سے ڈھیل دیتے ہوئے کہا۔

"او! آمی جانی -" (اوہ! میں جانتی ہوں) - اس نے چونکتے ہوئے مجھ پر طنز کیا اور پھر وہ کھڑکی کے پاس والی برتھ پر، جس پر میں بیٹھنا چاہتا تھا، بیٹھ گئی - مجھے ایسا لگا جیسے اس نے مجھے شکست دے دی ہو اور تھوڑی سی وحشت کے بعد میں بھی اس کے سامنے والی برتھ پر بیٹھ گیا -

ابھی تک ڈبے میں کوئی اور نہیں آیا تھا، الا یہ اس کا نوکر ایک کونے میں بیٹھا خاموش تماشائی کی

طرح ہم دونوں کے سوال و جواب سنتا رہا تھا۔ پھر اس نے جانکاری کے لئے کئی چھوٹے بڑے سوالات مجھ سے کیئے۔

"آپ کہاں رہتے ہیں، نرائن گنج کیوں جاتے ہیں، کیا نرائن گنج میں کوئی عزیز رہتا ہے یا یونہی سیر و تفریح کی غرض سے؟.... اور میں نے جھوٹ بولتے ہوئے جواباً کہا،

"سیر و تفریح کی غرض سے۔" میرا یہ جواب سن کر وہ کچھ اس انداز سے ہنسنے لگی، جیسے اس کا تیر نشانے پر صحیح لگا ہو، اس لئے کہ نرائن گنج کے کچھ علاقے اچھی تفریح گاہوں میں شمار ہوتے ہیں، دن بھر وہاں کی کاروباری منڈی میں سودے ہوا کرتے ہیں اور رات میں اکثر علاقے "دھندے" کیا کرتے ہیں۔ میں نے اسے کچھ زیادہ خوش دیکھ کر کریدنا چاہا۔

"میرے اس جواب پر اس قدر ہنسنے کی کیا بات ہے؟" پھر اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا،

"میں نے آپ کے بارے میں جو سوچا تھا، وہ درست نکلا۔"

"میرے بارے میں کیا اندازہ لگایا تھا؟" میں نے مزید اس سے کچھ کہلوانا چاہا، لیکن وہ کچھ گومگو میں ہو گئی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کھل کر کچھ کہنا چاہتی ہے، اس لئے کہ اس نے اشارے سے لڑکے کی موجودگی کا احساس بھی تو دلایا تھا۔ مجھے سگریٹ پینے کی خواہش ہو رہی تھی، لیکن اتفاق سے میرا ڈبا خالی ہو چکا تھا اور میں سگریٹ کے لئے باہر جانے ہی والا تھا کہ اس نے لڑکے کو بھیج دیا۔ ابھی انجن نہیں لگا تھا اور ڈبے کی روشنی بڑی دھندلی دھندلی سی تھی۔ میں جان کر پیچھے کے خالی ڈبے میں بیٹھتا تھا تاکہ گاڑی چلنے پر آرام سے لیٹ جایا کروں۔ آج بھی میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ لڑکے کے چلے جانے کے بعد وہ اٹھ کر میری برتھ پر بالکل قریب آگئی۔ میں تھوڑی دیر کے لئے سکتے میں آگیا، اس لئے کہ میرے لئے یہ بالکل نیا حادثہ تھا، لیکن ماحول کے سناٹے نے مجھے جلد ہی خود پر قابو پانے کی اجازت دے دی اور میں نے محسوس کیا کہ میرا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں چلا گیا ہے اور کوئی ہولے ہولے مجھ سے پوچھ رہا ہے،

"آپ نے اس روز کھڑکی کیوں بند کی تھی؟ آپ کو مجھ سے اس قدر کیا ہمدردی تھی جبکہ دوسرے مسافروں کو ذرا خیال نہیں ہوا تھا۔" میں نے صرف بات بنانے کے لئے کہا،

"تمہیں تکلیف ہو رہی تھی نا اور تم بھیگ بھی تو رہی تھیں!" وہ تھوڑی دیر کے لئے شکریئے کے احساس کی لذت میں ڈوب گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا ہو

میں نے تھوڑا اور قریب ہو کر پوچھا،

"تم چاش ہرا میں کہاں رہتی ہو؟" اور اس کے جواب میں وہ شرما کر سمٹ گئی۔ پھر وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ وہ لڑکا آتا ہوا دکھائی دیا اور وہ اپنی برتھ پر چلی گئی۔ میں نے اس لڑکے کے بارے میں پوچھا، جس کا وہ لحاظ کر رہی تھی، تو اس نے مختصراً بتایا کہ یہ میرے محلے کا لڑکا ہے اور بچپن ہی سے مجھ سے کچھ زیادہ مانوس ہے، اسی لئے میں جہاں جاتی ہوں، میرے ساتھ رہتا ہے۔ میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے مزید کچھ معلوم کرنا چاہا، لیکن اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا اور کہا کہ میں گھر پر پوری تفصیل بتاؤں گی۔ ڈبے میں دو تین لنگی پوش اور بھی آ گئے تھے اور آہستہ آہستہ لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے ڈبے کی تنہائی کا ماحول مجروح ہوتا جا رہا تھا۔ راستے میں اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی اور بیگانہ سی بنی رسالے میں کھوئی رہی۔

اسے خاموش دیکھ کر کچھ روز پہلے کا واقعہ میرے ذہن میں آتا گیا۔ وہ جمعے کی ایک تھکی تھکی سی شام تھی۔ میں دن بھر پریشان رہا تھا اور رات کو میری نائٹ ڈیوٹی تھی۔ اس روز میں بڑی جلدی میں اسٹیشن پہنچا تھا۔ میرے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلا تھا جس میں میری چادر اور تولیا تھا۔ گاڑی چھوٹنے میں چند ہی منٹ باقی رہ گئے تھے۔ بس سے اتر کر میں دوڑتا ہوا اسٹیشن پہنچا تھا اور پلیٹ فارم پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے "جنٹس ویٹنگ روم" کے سامنے والے ڈبے میں داخل ہو کر کھڑکی کے پاس والی برتھ صاف ہی کر رہا تھا کہ کسی نے مجھے چونکا دیا۔ اس روز بھی میرے کانوں سے یہی سوال ٹکرایا تھا،

"لیئے گاڑی کو تھائے جابے؟" کوئی بڑی دلکشی سے پوچھ رہا تھا،

"نرائن گنج جابے۔" میں نے مڑ کر اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا اور میرا جواب سنتے ہی میری صاف کی ہوئی جگہ پر یہی "دلچسپی" بیٹھ گئی تھی۔ اس روز تو مجھے اس کی اس حرکت پر اور بھی حیرانی ہوئی تھی، لیکن اس کے اس انداز نے میرے دن بھر کے تھکے تھکے سے جسم اور سہمے سہمے سے احساس کو زندگی بخش دی تھی اور میں نے ایک تازگی سی محسوس کی تھی۔ میں سامنے کی برتھ پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ اس کے اندر بڑی دلکشی تھی، اور کئی بار اپنی نظروں کے شیشے میں اتارنے کے لئے میں اسے چند ثانیئے تک دیکھتا رہا۔ اس کا گول سا چہرہ، اوسط درجے کی سیاہ شریر آنکھیں، اونچی پیشانی، ساون کی گھٹا کی طرح لمبے لمبے بال، سدا بہار مسکراتے ہوئے ہونٹوں کے درمیان موتیوں سے چمکتے ہوئے دانت اور ستواں ناک، کس قدر سحر آفرین تھا اس کا چہرہ جس پر ایک

بڑی معصوم سی کو ملتا کھیل رہی تھی! اس کا درمیانی قد، گداز جسم جس پر نارنجی رنگ کی ساڑی اور پھول دار بلاؤز، کس قدر بھلا لگ رہا تھا! اس نے معمولی سا سیاہ رنگ کا سینڈل پہن رکھا تھا جو پالش سے قطعی بے نیاز تھا۔ عمر کے لحاظ سے وہ سترہ اٹھارہ کے پیٹے میں لگتی تھی، لیکن بادی النظر میں وہ بڑی تیز معلوم ہوتی تھی۔ اس کا ہمہ وقت مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر ایسا لگتا جیسے اس پر کبھی غم کا سایہ تک نہ پڑا ہو۔ اس کے ہاتھ میں بنگلہ رسالہ تھا جس کا سرورق غائب تھا۔ وہ کبھی کبھی رسالے سے نظر اٹھا کر ڈبے میں دیکھ لیتی۔ پہلے ڈبا خالی تھا اور اب آہستہ آہستہ بھرتا جا رہا تھا۔ یکا یک اس کے چہرے پر ایک نمایاں تغیر پیدا ہوا جو شاید ڈبے میں مسافروں کی کثرت کا سبب تھا۔

رات جاڑے کی تھی اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ اس روز شام کو بارش بھی ہوئی تھی اور آسمان اب بھی سیاہ بادلوں کا منڈپ بنا ہوا تھا۔ میں نے پنکھا بند کر دیا اور اپنی شیروانی کے کھلے ہوئے بٹن لگا لئے، کیونکہ راستہ تیز چلنے سے جو پسینہ آگیا تھا، وہ اب سوکھ چکا تھا۔ پنکھا بند کرنے کے بعد میں اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ پلیٹ فارم کی طرف تکنے لگی تھی اور پلیٹ فارم پر مسافروں، خوانچہ والوں اور پان بیڑی کے ملے جلے شور میں وہ تھوڑی دیر کے لئے کھو سی گئی تھی۔ اتفاق سے ایک تیل مالش والے نے ڈبے میں داخل ہو کر اپنی مخصوص آواز میں "تیل مالش" کی آواز لگائی اور تھوڑی دیر کے لئے، ڈبے کا ہنستا، مسکراتا، سرگوشیاں کرتا ہوا ماحول اس کی آواز میں دب کر رہ گیا پھر اس کی آواز خود اعتمادی اور سکھ کی نغمگی بکھیرتی ہوئی فضا میں ڈوب گئی اور وہ دوسری آواز لگاتا ہوا ڈبے سے نیچے اتر کر بھیڑ کی گہما گہمی میں کھو گیا۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی "دلچسپی" بڑی زور سے ہنس پڑی۔ اسے ہنستا ہوا دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آگئی۔ شاید تیل مالش والے کی آواز نے اسے بہت متاثر کیا تھا اور تبھی تو اس کا چہرہ سرخ ہو کر دہکنے لگا تھا۔

میری برتھ پر دو تین نوجوان اور بھی آگئے تھے۔ چہرے مہرے سے وہ بھی بڑے تیز معلوم ہوتے تھے اور لہک لہک کر اپنی زندہ دلی اور خوش مزاجی کا ثبوت دینے لگے تھے۔ اپنے سامنے بیٹھی ہوئی رنگین و رعنا "دلچسپی" کو دیکھ کر وہ یوں خوش ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے تھے جیسے بھوکے بچوں کے سامنے دودھ اور چاول رکھ دیا گیا ہو۔ پھر وہ اپنی بنگلہ زبان میں دلچسپ باتیں کرنے لگے اور بات بات پر ہنس ہنس کر ڈبے کے ماحول کو خوشگوار بنانے لگے، لیکن ان کی باتوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ مستقل رسالے میں کھوئی رہی۔ گاڑی لیٹ تھی اور اب بجائے پونے آٹھ کے، ساڑھے آٹھ پر چھوٹنے والی تھی۔ گاڑی چھوٹنے کے کافی دیر بعد تک وہ کھڑکی سے باہر

دیکھتی رہی ۔ اس وقت اس کی دلکشی اور بھی بڑھ گئی تھی جب ہوا سے اڑتے ہوئے اپنے بال اور آنچل دونوں کو بیک وقت وہ درست رکھنا چاہتی، لیکن ہوا کے تیز جھونکے سے ایسا نہ کر پاتی ۔ اپنے اس کھیلنے کے سے انداز پر اسے خود ہنسی آجاتی اور اس کے ساتھ پورا ماحول ہنسنے لگتا۔

گنڈیریا سے جب گاڑی چھوٹی تو ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں اور رات کی سیاہی مہیب سے مہیب تر ہو گئی ۔ دفعتاً بوندیں کافی تیز ہو گئیں اور ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ کھڑکی کی راہ ڈبے کے اندر آنے لگیں ۔ اس نے نوکر کی مدد سے کھڑکی کا شیشہ گرانا چاہا، لیکن وہ اتنا سخت ہو گیا تھا کہ وہ ایسا نہ کر سکی اور مجبور ہو کر وہ کونے کی طرف ذرا کھسک کر بیٹھ گئی، مگر اندر آتی ہوئی بوندیں، اس کے کھلے ہوئے بازو اور رخسار پر، ہلکی ہلکی ضربیں لگاتی رہیں ۔ تھوڑی دیر تک وہ اس درد کی لذت میں ڈوبی رہی ، لیکن پھر وہ کچھ بیچین سی نظر آنے لگی جیسے بوندوں نے ہولے ہولے گدگدانا شروع کر دیا ہو ۔ میں کچھ دیر تک اس خیال سے دیکھتا رہا کہ شاید کوئی کھڑکی بند کر دے ، لیکن کسی کو اس کی بیچینی کا احساس نہ ہوا ۔ مجبوراً باتھ روم جاتے ہوئے میں نے کھڑکی بند کر دی ۔ اس نے مجھے شکر گزاری کے انداز سے دیکھا اور تھوڑی دیر کے لئے میرے قلب کی رفتار تیز سی ہو گئی ۔

باتھ روم سے جب میں واپس آیا تو وہ کافی اطمینان سے بیٹھ چکی تھی ۔ میں نے بند شیشے سے باہر کی طرف دیکھنا چاہا ۔ کچھ دور کے فاصلے پر سڑک تھی ۔ سڑک کے کنارے چھوٹی چھوٹی دکانوں پر جلتی ہوئی لالٹینیں اور گذرتی ہوئی "کاروں" کی ہیڈ لائٹس ایسی معلوم ہوتیں جیسے آسمان سے تارے ٹوٹ کر زمین کی گود میں آگئے ہوں اور زمین و آسمان کی کشش کے درمیان معلق ہو کر رہ گئے ہوں ۔ پھر وہ روشنی کے قمقمے میری نظروں سے بھاگتے رہے اور تاریکی کی آغوش میں گم ہوتے رہے ۔ میرا دل دھڑکنے لگا.... پہلے آہستہ آہستہ پھر زور زور سے ۔ یکایک گاڑی کی رفتار سست پڑنے لگی اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ پیپل کے سائے میں گاڑی رک گئی ۔ کئی مسافر میرے ڈبے سے اتر گئے ۔ دور فتح اللہ اسٹیشن کا لیمپ پوسٹ دھیمی لو کے ساتھ اونگھ رہا تھا اور اس کی دھم مدھم روشنی چوطرفہ شیشے سے نکل کر اندھیرے میں پھیل رہی تھی ۔ اس کے پاس ہی ایک سوکھا درخت بھی اکڑا اونگھ رہا تھا ۔ اس کی چھال تک گر چکی تھی ۔ اسے دیکھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کی سوکھی ہوئی ڈالیاں کہہ رہی ہوں ،

"ہم نے موسم کے بدلتے ہوئے تیور دیکھے ۔"

"اجنبی ہم کہ خزاں دیدہ ہیں ، بے جان نہیں ۔"

گاڑی چند منٹ کے بعد اپنی پوری رفتار سے چاش ہرا کے لئے روانہ ہو گئی - میرے قریب بیٹھے ، چہکتے ہوئے مسافروں نے بھی تھک کر چپ سادھ لی تھی اور تقریباً پورے ڈبے پر غنودگی چھاتی جارہی تھی ، لیکن وہ مسلسل بیٹھی رسالہ پڑھتی رہی اور اس کے قریب بیٹھا ہوا لڑکا اونگھتا رہا - دفعتاً گاڑی کی رفتار دھیمی ہونی شروع ہوئی - چاش ہرا اسٹیشن قریب تھا - وہ اترنے کے لئے تیار ہونے لگی - میں نے سوچا کہ وہ نرائن گنج تک جائے گی ، لیکن اسے یہیں تیار ہوتے ہوئے دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میرے سوچے ہوئے پر اوس پڑ گئی ہو -

اور آج پھر کئی روز کے بعد گاڑی کی رفتار دھیمی ہوتی جارہی تھی - لوگ آہستہ آہستہ اپنا سامان ٹھیک کرنے لگے - چاش ہرا اسٹیشن آگیا تھا - اس نے اپنا سامان درست کرتے ہوئے مجھے ہوشیار کر دیا ،

"جابن نا؟" (جائیے گا نہیں ؟) -

"ہاں! جابو -" (ہاں! جائیں گے) -

اور ہم چاش ہرا کے چھوٹے سے کاروباری اسٹیشن پر اتر گئے - کچھ دور جانے کے بعد میں نے رکشا کیا اور پھر چاش ہرا کی اونچی نیچی سڑکوں سے گذرتے رہے - میرا دل دھڑک رہا تھا.... ایک انجانے خوف سے - پھر میں نے اس سے پوچھا ،

"تم ڈھاکا کیوں جاتی ہو....؟"

وہ کہنے لگی ،

"میری ایک سہیلی اسلام پور میں رہتی ہے - میں اس کے ہاں اکثر جاتی ہوں - وہ بھی پہلے نرائن گنج میں اپنے ایک عزیز کے ہاں رہتی تھی - میری اس سے ملاقات کلاس سیون کی ہے - جب میں اس کے ساتھ اسکول میں پڑھتی تھی -"

رکشا ایک گلی کے موڑ پر جا کر رک گیا - میں نے پیسے دیئے اور اس کے ساتھ گلی سے گذر کر ایک چھوٹے سے مکان کے دروازے میں داخل ہو گیا - اس کے مکان میں دو کمرے تھے - ایک کمرہ بند تھا اور دوسرے کے بند دروازے سے ہلکی ہلکی روشنی چھن کر باہر نکل رہی تھی - اس نے بند کمرے کو کھول کر لالٹین جلائی - کمرے میں کچھ واجبی سا سامان تھا - ایک چوکی جس پر سفید سی چادر بچھی تھی ، ایک مٹی کا گھڑا جس میں پینے کا پانی تھا اور اس کے قریب ہی ایک لوٹا بھی خالی پڑا تھا ایک کونے میں ایک اسٹیل کا چھوٹا سا بکس چند بچی ہوئی اینٹوں کے اوپر رکھا تھا اور اسی پر لالٹین

مدھم لو سے جل رہی تھی۔ اس کی دھندلی دھندلی سی روشنی میں دیوار پر چند نئے پرانے کیلنڈر نظر آرہے تھے جن پر بیشتر عورتوں کی تصویریں بنی تھیں۔ مجھے چوکی پر بٹھا کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ دوسرا کمرہ ذرا دور تھا جس سے دھیرے دھیرے کسی کے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو کسی نے کراہتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا،

"ریکھا! ملا کوئی؟"

"ہاں باپو!" ہلکی نسوانی آواز میں جواب ملا اور پھر وہ میرے کمرے میں آگئی۔

"دوسرے کمرے میں کون کھانس رہا ہے؟" میں نے سہمے سے انداز میں پوچھا۔

"وہ میرے باپو ہیں۔ ان کی طبیعت دوپہر سے کچھ زیادہ خراب ہو گئی ہے۔" اس نے بڑی بے دلی سے جواب دیا۔

"اور کوئی نہیں ہے؟"

"نہیں! میں تنہا ہوں۔ میرے باپو ایک ماہ سے سخت بیمار ہیں۔ پہلے وہ مل میں کام کیا کرتے تھے، لیکن جب سے وہ بیمار ہوئے ہیں، مل نہیں گئے اور آجکل میں ہی ان کا سہارا ہوں۔ محلے والے بھی اب ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ اپنے سب بیگانے ہو چکے ہیں اور سب مجھے بری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔" اس نے ایک سانس میں سب کچھ بتا دیا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کتنی دکھی ہے۔ اس وقت اس کے چہرے پر وہ چنچلتا، مسکراہٹ اور وہ کھنکتی ہوئی ہنسی نہیں تھی جو کچھ دیر پہلے تھی۔ گاڑی میں اس کی ہمہ وقت کی مسکراہٹ دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس پر غم کا سایہ تک نہیں پڑا ہے، لیکن وہ میری بھول تھی۔ میرا اندازہ غلط نکلا۔ وہ میرے سامنے خاموش کھڑی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا،

"اتنے غموں کے باوجود بھی تم ہنستی رہتی ہو؟"

اس نے پھیکی سی مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

"اگر میں ہنستی نہ رہوں تو کوئی میرا ساتھ نہ دے۔ دنیا خوشی کا نغمہ سننے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ غم کا ساز بہت کم لوگ سننا چاہتے ہیں۔"

"لیکن زندگی کے ساز پر بیک وقت دونوں نغمے بجتے ہیں.... دکھ کے بھی اور.... سکھ کے بھی۔" میں نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

"مگر آپ جیسے کتنے ہی لوگ میری مسکراہٹ کے سہارے آئے اور اپنا مطلب پورا کر کے

چلے گئے۔ کسی نے اس قدر نہیں سوچا۔ آخر آپ کیوں اتنا سوچ رہے ہیں۔ آپ بھی تو انہیں جیسے مرد ہیں۔" اس کی آواز میں ایک چیلنج تھا اور وہ اپنی سیمابی طبیعت کی چنچلتا سمیٹے اداس ہو گئی تھی، لیکن اس کے انگ انگ میں ایک تھمی تھمی سی تڑپ اور ایک سہما سہما سا اضطراب کروٹیں لے رہا تھا۔ پھر میرے ذہن سے اس کا یہ جملہ .... "آپ بھی تو انہیں جیسے مرد ہیں" ٹکراتا ہوا میرے احساس میں بکھر گیا۔ میرے کان لال ہو گئے اور میرا جی چاہا کہ میں بھی "انہیں جیسا مرد" بن جاؤں لیکن میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا،

"مجھے دکھ کے نغمے بہت متاثر کرتے ہیں، اس لئے کہ ان میں بڑی نغمگی اور ابدیت ہوتی ہے۔" گلی کے دوسرے کنارے پر کوئی ہلکے ہلکے سروں میں گا رہا تھا۔

یکا یکی دوسرے کمرے میں کھانسنے کی آواز بہت تیز ہو گئی جیسے دھیمے سروں میں بجتے بجتے، ساز پر انگلیوں کی حرکت اچانک بڑھ گئی ہو۔ وہ فوراً دوسرے کمرے میں چل گئی، مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ واپس آئی۔ اس وقت اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ وہ بہت پریشان تھی اور اس نے بمشکل کہا،

"میرے باپو کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔" اور دوسرے ہی لمحے میں اس کمرے میں تھا، جہاں اس کا باپ بے سدھ پڑا زندگی و موت کی آخری کشمکش میں مبتلا تھا۔ میرا ہاتھ فوراً اس کی نبض پر گیا۔ نبض کی رفتار بہت سست تھی۔ میں نے پانی پلایا اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے ہلکی سی سانس لی۔ مجھے امید کی کرن نظر آئی اور میں نے اسے، ہمت دلاتے ہوئے کہا،

"گھبراؤ نہیں ریکھا! کمزوری سے تمہارے باپو کی ایسی حالت ہو گئی تھی۔" لیکن وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے جا رہی تھی۔ پھر میں ریکھا کے کمرے میں واپس چلا آیا۔ وہ بھی میرے ساتھ آئی اور میں نے اسے سمجھاتے ہوئے دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے لینے سے انکار کرنا چاہا اور تب میں نے اسے بتایا کہ میں اس غرض سے نہیں آیا تھا جو اس کا خیال تھا۔ کھانسنے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی اور میں اس سے رخصت ہو کر گلی کی تاریکی میں ڈوب گیا۔

(پہلی کہانی، نصرت۔ لاہور۔ ۱۹۶۱ء)

ٹیکا سو کے پھول

جب لطفو بیل کا پگہا تھامے گھر سے نکلنے لگا تو دفعتاً اسے خیال آیا کہ کیوں نہ گنڈاسا بھی ساتھ لے لے ۔ نہ جانے راستے میں کیا ہو اور پھر اسے ایک جنگل کے قریب سے بھی تو گذرنا ہے ، لہٰذا اس نے اپنے سونے کے کمرے سے گنڈاسا اٹھایا اور بیل کے آگے آگے بڑھنے لگا ۔ کچھ دور جا کر اس نے گنڈاسا کندھے پر رکھ لیا اور دھیمے سروں میں ایک گیت کے بول گنگناتا ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی سے گذرتا رہا ۔

وہ رئیس پور کے میلے میں بیل فروخت کرنے جا رہا تھا ۔

اس کی شادی کو ابھی دو ہی مہینے ہوئے تھے ۔ وہ ہفتہ بھر سسرال رہ کر اپنے گھر واپس آگیا تھا ، اس لئے کہ میلہ بھی قریب تھا اور اسے اپنی گرہستی کی دیکھ بھال بھی کرنی ہوتی ۔ وہ اپنے گھر کا اکیلا تھا اس پر ذمہ داریوں کے بہت سارے بوجھ تھے ، شادی کے بعد یہ بوجھ اور بھی بھاری ہو گئے ۔ اس کے سسر فتح محمد نے اس پر کچھ اور نئی ذمے داریاں ڈال دیں اور اپنی خواہشات کا ذکر کر کے اس کی پریشانیوں میں اور بھی اضافہ کر دیا ، لیکن وہ ذرا بھی نہ گھبرایا ۔ بڑی دلجمعی سے حالات کو سازگار بنانے لگا ۔ جب وہ سسرال میں تھا تو فتح محمد نے اسے اپنی جگہ زمین کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ ایک بیل کی کمی رہ گئی ہے ، اسے بھی وہ جلد ہی پوری کرنا چاہتا ہے ۔

" بیٹا ! تم بھی اگر میرا ہاتھ بٹاتے تو میں جلد ہی دوسروں کے برابر ہو جاتا ۔ گاؤں کے دوسرے لوگوں کے دو دو ہل چلتے ہیں ۔ کافی کھیت ہیں ، لیکن میرے پاس ایک ہی بیل ہے ۔ کھیت تو ہو گئے ہیں لیکن بیل .... " جیسے آرزوئیں اس کا کلیجا تھام لیتیں اور وہ آگے کچھ نہ کہہ سکتا ۔

لطفو پر ان باتوں کا بڑا اثر ہوا ۔ اس نے سوچا ،

" ابا ٹھیک ہی تو کہتے ہیں ۔ ان کے بعد تو ساری چیزیں میری ہی ہوں گی اور اب ان کی

شہرت کے ساتھ ساتھ میری بھی شہرت ہو گی۔ لوگ مجھے بھی اچھی نگاہ سے دیکھیں گے۔ پھر ان کی خواہشوں کا احترام کرنا، میرا بھی تو فرض ہے۔"..... لیکن اس نے سسر پر ان باتوں کو بالکل نہ ظاہر کیا، اس لئے کہ اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور وہ اپنے سسر سے بے تکلف نہ ہوا تھا۔

فتح محمد اپنے گاؤں کا بڑا ہی معتبر آدمی تھا۔ اکثر موقعوں پر جب گاؤں کا سرپنچ غیر حاضر ہوتا تو وہی سرپنچ بنا لیا جاتا اور ہر معاملے میں اس کی بات کو حرفِ آخر کی حیثیت دی جاتی۔ وہ نماز روزے کا بڑا پابند تھا۔ اس کے پاس کھیت کافی نہ تھے، لیکن اس کے اخراجات بہت تھے۔ آئے دن کی مہمان نوازی اور فضول خرچی نے اسے لوگوں میں بہت مقبول کر دیا تھا اور اس طرح اس نے شہرت تو خوب کمائی تھی، لیکن برا ہو ایسی شہرت کا جس میں اسے گھاٹا ہی گھاٹا تھا۔ دراصل اس نے شہرت خلوص سے خریدی تھی۔ وہ لوگوں کے اچھے بُرے وقت میں بڑے خلوص سے پیش آتا، گاؤں میں کئی ایسے گھر تھے جن میں کئی کئی روز تک اللہ کے نام کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا۔ مگر فتح محمد کا خلوص وہاں بھی روشنی کا کام کرتا۔ فتح محمد ان لوگوں کے لئے وہ سب کرتا جو ایک بھلے مانس کو کرنا چاہیئے۔ اس کی انہی ہمدردیوں کو دیکھ کر لوگوں کو تعجب ہوتا کہ آخر یہ شخص کیسے رہتا ہے۔ اس کی پیشانی پر کبھی بل بھی نہیں پڑتے۔

اس کے پاس ایک ہی بیل تھا جسے وہ گذشتہ سال میلے سے خرید لایا تھا اور اپنی ہی حیثیت کے دوسرے لوگوں کے ساتھ ساجھے میں کھیتی کیا کرتا تھا۔ کبھی وہ دوسرے کا ایک بیل لے کر اپنے کھیتوں میں جاش کرتا۔ کبھی اپنا ایک بیل دے کر دوسروں کو کھیت کی جاش کرنے دیتا۔ اسی طرح اس نے اپنی عمر کے پچاس سال گزار دیئے تھے۔ اس کی صرف ایک ہی بیٹی تھی اور اس کی بیوی کو مرے پانچ سال ہو چکے تھے، لیکن اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی، اس لئے کہ اس کی بیٹی ساحرہ جوان ہو چکی تھی اور اسے ساحرہ کی شادی کا زیادہ خیال تھا، کیونکہ ساحرہ کا سحر بہت سے دلوں پر اثر کر رہا تھا۔ جب کبھی وہ گاؤں کی گلیوں سے گزرتی تو من چلے لڑکے اسے دیکھ کر سرد آہیں بھرتے اور کبھی کبھی کسی پرانے فلمی گانے کی دھن چھیڑ دیتے۔ وہ تھی بھی ایسی ہی.... گوری چٹی، چھریرا بدن اور دراز قد کی سندری جس کا چاند سا مکھڑا ہمہ وقت گھونگھٹ کی اوٹ میں چھپا رہتا۔ اسے کبھی کسی نے چھیڑنے کی ہمت نہ کی تھی، البتہ راجا بڑا شریر تھا۔ وہ خود تو کچھ نہ کہتا، لیکن دوسرے لڑکوں سے چھیڑ چھاڑ کراتا رہتا۔ راجا کی یہ حرکت ساحرہ کو بڑی بری لگتی، لیکن وہ دل ہی دل میں اسے محسوس کر کے رہ جاتی، اس لئے کہ جب بھی وہ اپنے بابا سے راجا کے خلاف

شکایت کرنے کو سوچتی تو وہ کانپ اٹھتی اور فتح محمد کا رعبدار چہرہ اس کے سامنے آجاتا۔ اس کے مضبوط بازو، چوڑا چکلا سینہ اور گٹھیلا جسم..... جوانی میں اچھے اچھے اس کے سامنے نہیں ٹکتے تھے، لیکن بڑھاپے میں بھی اس کے چہرے پر وہی رعب داب تھا اس کی آنکھوں میں بڑھاپے کی اداسی نہ تھی بلکہ جوانی کی چمک تھی اور اس کی آنکھوں میں وہی لال لال ڈورے پڑے رہتے۔ چہرے پر داڑھی اگ آئی تھی اور اس کی مونچھوں کے بال بڑھتے بڑھتے داڑھی کے بال کے ساتھ مل کر انہیں کا ایک جزو معلوم ہوتے تھے، لیکن وہ ہر ہفتے بالائی لب پر جھکے ہوئے بالوں کو بڑی احتیاط سے کٹواتا۔ وہ ہمدرد ضرور تھا، لیکن کبھی کسی کی بیجا حرکت نہیں برداشت کرتا تھا۔

"اگر راجا کے متعلق میں نے انہیں کچھ بتادیا تو راجا پر آفت ہی آجائے گی۔" اس نے سوچا "نہیں..... مجھے بابا کو کچھ بھی نہیں بتانا چاہئے ورنہ مجھ پر بھی کڑی پابندی لگ جائے گی۔ اس نے یہ سوچتے ہوئے نفی میں سرہلادیا۔

ساحرہ کو راجا کی باتیں بُری ضرور لگیں، لیکن اکثر تنہائی میں وہ انہیں باتوں کو سوچ کر مسکرانے لگتی اور بے اختیار اس کے منہ سے "راجا" نکل جاتا اور پھر سوچ بچار کی دنیا میں وہ راجا ہی کے گرد گھومتی رہتی جیسے راجا اور ساحرہ ایک ہی پرکار کے دو (۲) سرے ہوں اور ان سے ایک مکمل دائرہ بنتا ہو، لیکن وہ سرے کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں تاوقتیکہ انہیں کوئی نہ ملائے راجا ساحرہ کی زندگی پر حسین بادل کی طرح چھاتا جارہا تھا کہ اچانک جیسے تیز ہوا کے جھونکے بادل کو اڑا لے گئے اور کڑی دھوپ نکل آئی اور اس دھوپ میں فتح محمد کا چہرہ دمک اٹھا جیسے اس کے چہرے پر تمام دھوپ پھیل گئی ہو اور اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے اور بھی نمایاں ہوگئے ہوں۔ وہ سوچتے سوچتے چونک پڑتی جیسے کچھ یاد آگیا ہو اور جب پلٹ کر دیکھتی تو فتح محمد کے بھاری قدموں کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرا کر ساری فضا کو بوجھل کر دیتی۔ اپنے بابا سے وہ بہت ڈرتی تھی حالانکہ اب فتح محمد کے چہرے پر پہلا سا رعب داب نہ تھا بلکہ اب تو اس کی پیشانی پر تجربات کی بہت ساری لکیریں نظر آتیں اور وہ ساحرہ کو تیز لہجے میں بھی کچھ نہ کہتا، لیکن ساحرہ اس کی آنکھوں کے لال ڈورے سے ہی سہمی رہتی اور وہ لاکھ بیٹی سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے خوش رکھنا چاہتا، لیکن سوائے "ہوں!" "ہاں!" کے وہ کچھ نہ کہتی۔

سے بیتتا رہا..... فتح محمد کی داڑھی کے بال کھچڑی ہوتے گئے۔ اس کی پیشانی پر بہت ساری شکنیں پڑتی گئیں جیسے کالی مٹی دھوپ کی شدت سے پھٹ جاتی ہے، لیکن اس کی آنکھوں کے

ڈورے خونی ہوتے گئے۔ ساحرہ سیم کے پودے کی طرح دن بدن بڑھتی رہی اور پھر اس کی بیلیں چھپر پر مکڑی کے چھتے کی طرح پھیل گئیں۔ پھر اس میں پھول نکل آئے جیسے بہار کے دن آگئے ہوں اور کھلیان میں ٹیکاسو کے سرخ سرخ پھول پورے درخت پر بکھر گئے ہوں۔ فتح محمد کو اس بہار کے آنے کا پورا احساس تھا بلکہ وہ تو بڑی مدت سے اس بہار کا منتظر بھی تھا، اس لئے کہ وہ اپنے کھلیان میں کھلے ہوئے ٹیکاسو کے پھولوں کی مالا بنا کر کسی کے گلے میں ڈالنا چاہتا تھا اور پھر وہ گاؤں کا ایک اہم فرد بھی تو تھا۔ آج تک اسے اپنی نیک نامی ہی کا خیال رہا تھا اور پھر ایک شام ساحرہ کو بڑی دھوم سے بیاہ دیا گیا۔ کہتے ہیں ایسی شادی گاؤں میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ فتح محمد اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا۔ اس کے اعضا میں نئی قوت آگئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نئی چمک پیدا ہو گئی تھی داماد بھی گھر کا اچھا ملا تھا۔ گھر گرہستی، دھن دولت سبھی کچھ تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ فتح محمد کو اپنے باپ کی طرح مانتا تھا، گویا سسر نے باپ کی کمی پوری کر دی تھی۔ اس نے سسر کی کبھی کوئی بات رد نہ کی تھی۔ فتح محمد بھی اسے گاہے گاہے سمجھاتا رہتا،

" بیٹا کریم! جگہ زمین خریدو اور اپنی گرہستی بڑھانے کا خیال رکھو۔ دوسروں کے پاس کتنی کتنی زمینیں ہیں۔ (۲) دو (۲) دو بل چلتے ہیں۔ تم بھی دوسروں کا مقابلہ کرنے کا خیال رکھو، اس لئے کہ تمہارا نام ہو گا تو میرا بھی نام ہو گا۔ میں تمہیں اپنا ہی بیٹا سمجھتا ہوں۔ ساحرہ میری بڑی پیاری بیٹی ہے اس نے ہر کڑے وقت میں میرا ساتھ دیا ہے۔ تم بھی میری آخری خواہشوں کو پورا کرو۔ میرے پاس بھی اگر روپیہ ہوتا تو میں بھی دوسروں کا مقابلہ کرتا، لیکن مجھے تمہاری ذات پر پورا بھروسا ہے۔ تم میری خواہشوں کو ضرور پورا کرو گے۔"

کریم سسر کی باتیں بڑے دھیان سے سنتا اور سوچتا،

"ابا ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ ان کے بعد تو ساری چیزیں میری ہی ہوں گی۔" وہ جیسے اپنے آپ میں اچھے کاموں کے کرنے کا حوصلہ پاتا۔

شادی ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ فتح محمد کے پاس کافی کھیت ہو گئے۔ گاؤں والے کریم کی بڑی تعریف کرتے اور وہ دوسرے دامادوں کے لئے ایک مثال بن گیا تھا۔ فتح محمد اپنے داماد سے بہت خوش تھا۔ وہ اس کا بڑا خیال رکھتا اور اس کی باتوں کو پتھر کی لکیر سمجھتا، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود موقع محل دیکھ کر وہ داماد کو روپیہ جمع کرنے کا سبق ضرور دے دیتا۔ کریم نے سسر کے لئے مختصر سے عرصے میں بہت کچھ کر دیا تھا۔ اب صرف ایک بیل کی کمی رہ گئی تھی،

اسے بھی وہ جلد ہی پورا کرنا چاہتا تھا تاکہ سسر داماد مل کر کھیتی کریں اور دوسروں کا مقابلہ کر سکیں۔

ایک روز شام کو جب کریم اپنے صحن میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا کہ دوران گفتگو میں اتوارو نے اسے بتایا کہ رئیس پور کے میلے میں اس بار بہت اچھے جانور آئے ہیں۔ اس نے فتح محمد کو بتاتے ہوئے کہا،

"ابا جان! اس بار چل کر میلے سے بیل خرید لینا چاہیے، کیونکہ اساڑھ بھی قریب آگیا ہے اور اس سال ایک بیل کا ہونا ضروری ہے۔ کب تک دوسروں کے ساجھے میں کھیتی کر کے نقصان اٹھایا جائے گا۔"

فتح محمد تو اندھے کی طرح خوش ہو گیا جیسے اسے دو آنکھیں ملنے والی ہوں اور دراصل کھیتی کے لئے دو بیلوں کی ضرورت دو آنکھوں سے کچھ کم بھی تو نہ تھی۔

"ضرور بیٹا! بلکہ تم کل ہی چلے جاؤ۔ ایک بیل کا ہونا بہت ضروری ہے۔" اس نے انتہائی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مشورہ دیا۔

"آپ نہیں جائیں گے ابا!" اس نے سسر سے پوچھا۔

"میں چلتا ضرور.... لیکن آج ہی ایک ضروری کام سے شیخ نورا جانا ہے۔ تم چلے جاؤ۔ اگر وقت ملا تو میں بھی پہنچ جاؤں گا ورنہ بیل خرید لینا۔"

کریم نے اس سے کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا اور میلے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ فتح محمد اسی روز شام ہوتے ہی شیخ نورا کے لئے روانہ ہو گیا اور پھر دوسرے روز کریم بھی ساحرہ سے رخصت ہو کر میلے چلا گیا۔ ساحرہ تنہا رہ گئی۔ تنہائی میں کریم کی چھیڑ چھاڑ اسے یاد آتی رہی۔ اور وہ من ہی من میں پیار کی ساری لذتیں محسوس کر کے خوش ہوتی رہی۔ جب اس کا جی گھبراتا تو وہ گاؤں کی لڑکیوں کو بلا کر ان سے طرح طرح کی باتیں کرتی، نئی نویلی دلہنوں کو چھیڑتی اور ان سے اپنا جی بہلاتی رہتی۔ ساحرہ بڑی خوش مزاج اور ملنسار تھی۔ گاؤں میں اس نے کسی سے تو تو میں میں تک نہ کی تھی۔ وہ چھوئی موئی کی طرح بڑی شرمیلی اور خوش اخلاق تھی اور ویسا ہی کریم بھی تھا۔

فتح محمد شیخ نورا سے واپس آگیا، لیکن کریم واپس نہ آیا۔ دو روز تک بڑی پریشانی رہی۔ طرح طرح کے اندیشے پیدا ہوتے رہے۔ ساحرہ بہت گھبراتی اور بار بار فتح محمد سے پتا لگانے کو کہتی فتح محمد نے آس پاس کے گاؤں میں آدمی بھیجے، خود بڑی دوڑ دھوپ کی لیکن کوئی پتا نہ چلا۔ تیسرے

دن شام کو خبر ملی کہ رئیس پور کے قریب جنگل میں ایک لاش ملی ہے جو کریم کی ہے اور پھر کریم کے قتل کی خبر آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ فتح محمد خبر سنتے ہی سکتے میں آگیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا جیسے اسے بہت شدید دکھ پہنچا ہو اور سارے غم کو وہ کسی نشہ آور چیز کی طرح پی گیا ہو۔ وہ اسی طرح خاموش اور گم سم رہنے لگا جیسے کریم کے غم نے اسے ڈس لیا ہو۔ ساحرہ کا برا حال تھا۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ رہ رہ کر اسے غش آتا تھا گاؤں کی عورتیں اور ساری ہمعمر لڑکیاں بھی اس کے ساتھ رو رہی تھیں۔ پیر و جواں سبھی اس کے غم میں شریک تھے۔ سارے گاؤں والوں کو کریم کے قتل ہو جانے کا غم تھا اور فتح محمد کو لوگ سمجھا بجھا کر اس کے غم کو ہلکا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا نہ گرنا، بڑا تشویشناک ہو گیا تھا۔ لوگوں کو ڈر ہو گیا کہ مبادا غموں کو ضبط کرتے کرتے اس کا دل ڈوب جائے۔

ہفتے بھر وہ اسی طرح خاموش رہا۔ ساحرہ رو رو کر تھک چکی تھی اور اب آہستہ آہستہ اسے صبر آ رہا تھا۔ پھر کئی ہفتوں نے مل کر مہینے کا روپ دھار لیا اور مہینے بھی ہولے ہولے وقت کے بہاؤ پر بہتے گئے۔ فتح محمد کے خاموش چہرے کی اداسی بھی دھوئیں کی طرح اڑتی گئی اور وہ ساحرہ کو خوش رکھنے اور اس کے غم کو ہلکا کرنے کی فکر میں دن رات رہنے لگا۔ اس کے لئے بازار سے طرح طرح کی چیزیں لا کر اسے خوش کرنے لگا۔ پڑوسی کے گھروں میں اسے گھومنے جانے کے لئے کہتا، اس کی ہمعمر لڑکیوں سے ملنے جلنے کے لئے اسے بھیجتا رہتا۔ پہلے کی طرح اس پر کسی قسم کی پابندی بالکل نہ تھی بلکہ وہ گاہے گاہے اس کے سامنے گاؤں کی عورتوں سے اس کی شادی کا تذکرہ بھی کرتا رہتا۔ غرض کئی مہینے تک فتح محمد نے ساحرہ کو خوش رکھنے کے لئے کافی روپے صرف کئے اور کریم کے سارے روپے ساحرہ کی خوشیوں کے لئے پانی کی طرح بہہ گئے۔

کریم کی جائداد بھی فتح محمد کی جائداد ہو گئی۔ اب فتح محمد کو کھیتوں کا رونا نہ تھا بلکہ اب تو وہ گاؤں کے دوسرے لوگوں کا مقابلہ اچھی طرح کر رہا تھا اور بیٹی کے ساتھ خود بھی خوش رہ کر زندگی گزار رہا تھا، لیکن بازار سے خریدی ہوئی خوشیاں دیرپا نہیں ہوتیں۔ وقتی خوشی تو ضرور ہوتی ہے، لیکن دائمی خوشی کب ہوتی ہے اور پھر ساحرہ کی خوشیاں تو چھینی جا چکی تھیں جیسے ادھ کھلے پھول کو توڑ لیا گیا ہو، جیسے پھول کو کھلنے سے پہلے ہی مسل دیا جائے۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ ساحرہ کی جوانی ایک شادی کے بعد خوب کھل گئی تھی جیسے منہ بند کلی کو شبنم کے قطروں نے زندگی بخش دی ہو اور صبح ہونے سے پہلے ہی کھِل کر ایک شگفتہ پھول بن گئی ہو۔ ساحرہ کو پھر ایک باغباں کی

ضرورت کا احساس ہونے لگا جو اس پھول کی حفاظت کر سکتا، اور اسے تیز دھوپ سے بچا سکتا۔

فتح محمد بھی تو اسی کی خوشیوں کے لئے اتنا کچھ کر رہا تھا۔ اسے تو ساحرہ کی خوشیوں کی زیادہ فکر تھی اور پھر نئے داماد کی جو اس کی خواہشوں کو پورا کر سکتا اور جو کریم کی طرح اس پر جان دینے والا ثابت ہوتا پھر کئی مہینوں کے بعد شہنائیوں کی آواز سے پورا گاؤں ایک بار پھر گونج اٹھا۔ فتح محمد نے اسی دھوم سے ساحرہ کی شادی لطفو سے کر دی۔ غموں کے دبیز پردے پر خوشیوں کی حسین چادر تن گئی اور ٹیکا سو کے پھول پھر ایک بار کھلیان میں اپنی سرخی سمیت جل اٹھے۔

فتح محمد اپنے نئے داماد سے بہت خوش تھا۔ اسے کریم جیسا داماد ملا تھا۔ لطفو بھی سسر کی باتیں بڑے دھیان سے سنتا۔ اسے بھی فتح محمد وہی سبق پڑھاتا رہا جو کریم کو پڑھا چکا تھا،

" بیٹا لطفو! دوسروں کے پاس کافی کھیت ہیں۔ دو دو ہل چلتے ہیں، لیکن میرے پاس ایک ہی بیل ہے۔ کریم کی کوششوں سے کھیت تو ہو گئے ہیں، لیکن بیل ابھی تک نہیں ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سال اپنا ایک ہل چلے اور دوسروں کے ساجھے میں کھیتی نہ کی جائے۔ بڑا نقصان ہوتا ہے۔" لطفو نے سوچا،

" ابا جان ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ اگر میں بیل خرید کر، کھیتی شروع کر دوں گا تو میری ہی گرہستی ہو گی اور پھر ابا جان کے ساتھ ساتھ میرا بھی نام ہو گا۔"

ہر سال کی طرح اس بار بھی رئیس پور میں میلہ لگا۔ لطفو نے سوچا کہ کیوں نہ اپنے گھر کا ایک بیل بیچ کر کچھ اور روپے لگا کر ایک بہت ہی اچھا بیل خرید اجائے۔ یوں تو اپنے بیل سے بھی کام چل سکتا ہے، لیکن ابا جان کا خیال ہے کہ دوسروں سے مقابلہ کیا جائے۔ جب مقابلہ ہی کرنا ہے تو کیوں نہ اچھی طرح مقابلہ کیا جائے تاکہ دوسرے مقابلے میں نہ آسکیں۔ اس میں اس کا بھی نام ہو گا اور ابا جان کی تو مانگی مراد ہی پوری ہو جائے گی۔ یہی سوچ کر وہ سسرال سے جلد ہی اپنے گھر چلا گیا اس نے سسر کو بتایا ضرور تھا، لیکن وہ میلے جانے سے ایک روز پہلے ہی کہیں کسی ضروری کام سے جا چکا تھا، لہٰذا لطفو اکیلے ہی بیل کا پگہا تھامے گھر سے نکل پڑا۔ پھر دفعتاً اسے خیال آیا اور اس نے گنڈاسا بھی ساتھ لے لیا۔

راستے بھر نئے بیل کا خیال آتا رہا اور وہ ذہن میں نئے بیل کا خاکہ تیار کرتا آگے بڑھتا رہا....

" میں اپنے ٹیکے برابر کا بیل خریدوں گا جس کی بڑی سی ڈیل ہو گی، دھنک کی طرح حسین

اور گول گول، چھوٹی چھوٹی مٹھی بھر کی سینگ جو سرسوں کے تیل سے ہر وقت چمکتی رہے گی اور اس کے ماتھے پر سیندور کا ٹیکا ہو گا جسے دیکھنے کے لئے سارا گاؤں ٹوٹ پڑے گا۔ ابا جان تو مارے خوشی کے پھولے نہ سمائیں گے۔"

اس قسم کے بہت سارے خیالات اس کے ذہن میں گرد کی طرح جمتے رہے۔ کائنات چاندنی کے سفید لباس میں بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ رات سائیں سائیں کر رہی تھی اور آس پاس سے آتی ہوئی گیدڑوں کی آواز تنہائی کے احساس کو اور بھی خوفناک بنا رہی تھی۔ دور دور تک اکا دکا درخت خاموش کھڑے اونگھ رہے تھے۔ پگڈنڈی لطفو کے آگے آگے بڑھتی ہوئی چند درختوں کے بیچ سے گزرتی تھی، لیکن لطفو ابھی ان درختوں تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ سامنے ان درختوں کو دیکھ رہا تھا جو آپس میں گلے مل رہے تھے جیسے ایک دوسرے سے رخصت ہوتے ہوئے باپ بیٹے، میاں بیوی اور سسر داماد آپس میں گلے ملتے ہیں۔ داہنی طرف جنگل خاموش پڑا تھا۔ لطفو کے ساتھ ساتھ اس کا سایہ بھی چل رہا تھا اور چاندنی رات میں اس کا گنڈاسا چمک کر ہمت بڑھا رہا تھا۔ جب وہ درختوں کے بیچ سے گذرنے لگا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی سایہ دو گز کے فاصلے پر ایک درخت سے لگا حرکت کر رہا ہو۔ وہ مڑ کر دیکھنا ہی چاہتا تھا کہ اس سائے نے جھپٹ کر اس پر وار کر دیا، لیکن اس کا گنڈاسا زمین میں دھنس گیا۔ وہ پھرتی سے مڑا اور بیل کا پگھا چھوڑتے ہوئے اس پر ایک بھرپور وار کر دیا۔ ایک چیخ کے ساتھ سایہ زمین پر گر پڑا۔ اس کا بازو کٹ کر جھول رہا تھا۔ لطفو جب اسے پہچاننے کے لئے جھکا تو گنڈاسا ایک دم اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کے سامنے وہ شخص تھا جس کے متعلق وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا جو اس کا سب سے بڑا خیر خواہ تھا اور جو اسے اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا تھا۔

چاندنی خون کے آنسو روتی رہی.... اور جنگل میں ٹیکا سو کے پھول خون سے زیادہ سرخ ہوتے گئے۔

(نصرت۔ لاہور۔ ۱۹۶۲ء)

نورا

"ابے سالے!..... تیری ماں تو اٹھنی چونی پر دوڑی جاتی ہے....."
شمسو کی آواز بندوق میں بھری ہوئی گولی کی مانند نکل رہی تھی ۔ وہ لال لال آنکھیں نکالے نورا کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کا بس چلے تو وہ اسے کچا ہی چبا جائے ۔ نورا اس کی گالی کے جواب میں اینٹ اٹھانے کے لئے بڑھا، مگر دوسرے ٹیکسی والوں نے بیچ بچاؤ کر دیا ورنہ آج وہ خون خرابا کر دیتا ۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنا بایاں کان سہلا رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے ان بے قصور آنسوؤں کو پونچھ رہا تھا جو اس کے گالوں پر ایک موٹی سی لکیر بناتے ہوئے پھیل رہے تھے ۔ غصے سے اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا اور وہ رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا،
"اس نے میری ماں کو کیوں گالی دی..... یہ مجھے دو جوتے مار لیتا، مگر اس نے میری ماں کو کیوں گالی دی ؟....." وہ بار بار اس طرح شمسو کی طرف بڑھتا جیسے اس کا منہ نوچ لے گا ۔ دونوں ایک دوسرے کو بری بری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور گلستان ٹیکسی اسٹینڈ پر لوگوں کی بھیڑ آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی ۔ لوگ ایک دوسرے سے جھگڑے کی اصل وجہ پوچھ رہے تھے، مگر کسی کو اصل معاملے کا علم نہ تھا ۔ پھر کچھ لوگوں نے جھگڑا نمٹانے کی خاطر دونوں کو لے جا کر الگ چھوڑ دیا ۔ نورا ڈی ۔ ایم ۔ او ۔ کے بنگلے کے گیٹ پر کھڑا رو رہا تھا کہ اتنے میں اس کا ساتھی کریمو آ گیا نورے کو روتا ہوا دیکھ کر وہ پریشان سا ہو گیا ۔ اور اس نے رونے کا سبب پوچھا ۔ نورا نے صرف اتنا کہا،
"شمسو نے مجھے مارا اور ماں کی گالی دی ہے ۔" اس کے تھمتے ہوئے آنسوؤں میں پھر سے روانی آ گئی تھی ۔ کریمو کے دل میں آیا کہ جا کر شمسو سے سبب پوچھے، مگر جانے کیا سوچ کر وہ رک گیا ۔ شاید وہ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا، چنانچہ وہ نورا کو لے کر ریلوے کالونی کی طرف چل پڑا

جہاں وہ دونوں ایک ساتھ رہتے تھے۔

رات آہستہ آہستہ یوں آرہی تھی جیسے دل میں پیار آتا ہے، مگر فضا میں اڑتی ہوئی گرد رات کو سوگوار بنا رہی تھی۔ ریلوے کالونی میں یہاں وہاں کھڑے بجلی کے کھمبے کے جلتے ہوئے بلب اپنی زرد روشنی سے ماحول کی اداسی پر ایک گہری چھاپ ڈال رہے تھے۔ آس پاس بنے ہوئے در ما کے مکانوں سے لالٹین کی روشنی یوں نکل رہی تھی جیسے اجاڑ دل میں امید کی آخری لو ٹمٹا رہی ہو۔ نورے کو گھر لے جاکر کریمو نے سمجھایا۔ طرح طرح سے اسے دلاسے دیئے، مگر اس کے آنسو نہ رکے نورے کو روتا ہوا دیکھ کر کریمو کو بڑی وحشت ہو رہی تھی۔ وہ کسی کے آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کا دل بڑا نرم تھا۔ کسی کو دکھ میں دیکھ کر اس کا دل لرز اٹھتا تھا، لیکن نورے کے آنسو جو کریمو کے سمجھانے بجھانے پر بھی نہ رکے تو وہ اسے اسی طرح چھوڑ کر مختلف فلمی گانوں کی کتابیں لے کر نکل پڑا۔ اسے دھندے پر جانے کی دیر ہو رہی تھی۔ وہ دن بھر اسٹیڈیم گیٹ پر بیٹھا انناس کے قتلے بیچتا اور شام کو گلستان سینما کے اردگرد فلمی گانوں کی کتابیں بیچتا۔ یہی اس کا روزانہ کا معمول تھا اور وہ اپنے اسی حال میں خوش تھا۔

کریمو کے چلے جانے کے بعد نورے نے بتی کی لو کم کر دی اور فرش پر بچھی ہوئی گدڑی پر لیٹ گیا اور اینٹوں کو جوڑ کر بنائے ہوئے تکئے پر سر رکھ کر اپنی ماں کے بارے میں سوچنے لگا۔ کوئی تین چار سال پہلے وہ شفا خانہ حیوانات کی چار دیواری کے پاس ایک جھونپڑی میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی جھونپڑی سے تھوڑی ہی دور مہتروں کی جھونپڑیاں کسی نالے پر بنی ہوئی پلیا کی مانند تھیں جن کی تاریکی کو دن میں سورج کی روشنی بھی مشکل سے دور کرتی تھی اور اس کے آس پاس کی فضا بڑی متعفن تھی۔ ان جھونپڑیوں کے قریب ہی سے ریلوے لائن گزرتی تھی۔ وہ اس وقت آٹھ نو برس کا تھا۔ اس کی ماں ریلوے کالونی کے مختلف گھروں میں جھاڑو دینے، برتن مانجھنے اور مصالحہ پیسنے کا کام کرتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بشیر میاں کے گھر میں کھانا پکاتی تھی۔ بشیر میاں کے بیوی بچے رنگپور ہی میں رہ گئے تھے اور وہ کچھ عرصے کے لئے تبدیل ہو کر ڈھاکے آگئے تھے۔ بشیر میاں ڈھاکا ریلوے اسٹیشن پر بکنگ کلرک تھے۔ وہ بڑے ہنس مکھ، زندہ دل اور کھلے ہاتھ کے آدمی تھے۔ وہ اس کا اور اس کی ماں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اس کے لئے کھانے پینے کی چیز لے آتے اور اس کی ماں کے ہاتھ بھجوا دیتے۔ کبھی کبھار ایک دو جوڑے کپڑے یا ایک دو بنیائن اور لنگی خرید کر لے آتے اور اسے بلا کر خود اپنے ہاتھ سے دیتے۔ بشیر میاں کی اس ہمدردی کو دیکھ

کر پاس پڑوس والے کچھ اور ہی خیال کرتے اور جب شام کو وہ ریلوے کالونی کے بچوں کے ساتھ کھیلنے جاتا تو اکثر نوجوان لڑکے اسے ذرا ذرا سی بات پر چڑھاتے.....

"ابے! تیری ماں تو بشیر میاں کے ساتھ رہتی ہے۔"

"ارے! یہ تو بشیر میاں کا لڑکا ہے۔"

"بشیر میاں تو اس کے کپڑے بنواتا ہے۔"

کئی لڑکوں کی ایسی ویسی باتیں سن کر وہ بہت پریشان ہوتا، مگر اس نے اپنی ماں سے کبھی ان باتوں کا ذکر نہ کیا، اس لئے کہ ایسی باتیں سن کر اس کی ماں کو دکھ ہوتا۔ بھلا وہ ماں کو دکھی کیسے دیکھ سکتا تھا!

ایک رات خلافِ معمول ہوا تیز چلنے لگی۔ آسمان پر گرج، چمک بھی ہونے لگی اور بارش کے کچھ آثار پیدا ہو گئے۔ رات بہت تاریک تھی اور ہوا کے تیز جھونکوں سے چراغ کی لَو ڈوبنے، ابھرنے لگی۔ موسم میں اچانک اتنی تبدیلی دیکھ کر نورے کا دل گھبرانے لگا۔ اس کی ماں ابھی تک کام کر کے واپس نہیں آئی تھی اور ہوا تھی کہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی جیسے عنقریب طوفان آنے والا ہو۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد جب اس کی ماں نہ آئی اور موسم بگڑتا ہی چلا گیا تو وہ خود اٹھا اور بشیر میاں کے گھر کی طرف چل پڑا، اس لئے کہ اکثر انہیں کے ہاں کھانا پکانے میں اسے دیر ہوتی تھی۔

بشیر میاں کا کمرہ تاریک اور سنسان تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے کوئی نہ ہو، مگر اس نے احتیاطاً آواز دی،

"ماں!....."

اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد اس کی ماں کمرے سے گھبرائی ہوئی آئی۔ ماں کو دیکھ کر وہ خاموشی سے اپنے گھر کی طرف ہو لیا۔ گھر پہنچنے کے ساتھ ہی اس کی ماں بھی آئی اور وہ ماں پر برس پڑا۔ اس نے ماں کو وہ ساری باتیں سنا ڈالیں جو لوگ اسے طعنے کے طور پر کہا کرتے تھے اور جن کا اسے یقین نہ آتا تھا۔ اس نے ماں کو منع کر دیا کہ اب وہ کام کرنے کہیں نہیں جائے گی بلکہ کل سے وہ خود کام کرے گا۔ ہوا کا زور آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا، مگر اس کی ماں کے دل میں اٹھتا ہوا طوفان بڑھتا ہی چلا گیا۔ ایسی انہونی بات کے متعلق اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

دوسرے دن وہ خود کام ڈھونڈنے نکلا۔ مختلف اوسط درجے کے اچھے اور گھٹیا ہوٹلوں

میں گیا اور ہوٹلوں کے مالکوں سے کوئی بھی کام دینے کی درخواست کی۔ ایک دو ہوٹلوں میں اسے کام بھی ملا، مگر اس کے ساتھ ہی یہ شرط بھی تھی کہ اسے صرف کھانا ملے گا اور ہوٹل میں ہی رہنا پڑے گا۔ یہ شرط اسے منظور نہ تھی، اس لئے کہ وہ ماں کو چھوڑ کر رہنا نہیں چاہتا تھا۔ دن بھر ادھر ادھر ڈھونڈنے کے بعد جب اسے کوئی بھی کام نہ ملا تو وہ شام کو ٹیلیگراف آفس والی سڑک سے اپنے گھر کی طرف لوٹنے لگا۔ سڑک کے ایک کنارے پر، جہاں ٹنگیل اور میمن سنگھ جانے والی بس کا اسٹینڈ ہے، اس کے بالکل مقابل کچھ ٹھیلے والے، ٹھیلے پر بیٹھے بڑی بے فکری سے کسی بنگلہ فلم کے گانے گا رہے تھے۔ انہیں خوش دیکھ کر نورا تھوڑی دیر کے لئے رک گیا۔ اس کا دل بے اختیار چاہ رہا تھا کہ کاش اسے ٹھیلا چلانے ہی کا کام مل جاتا تو وہ انہیں لڑکوں کے ساتھ ہنسی خوشی دن گزارتا۔ اس کے ذہن میں کیسے کیسے مسرت آمیز خیالات آ رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے دن بھر کی پریشانی، مایوسی، بھوک پیاس اور تھکن کے احساس تک کو بھول گیا تھا اور ہنستے کھیلتے لڑکوں کو دیکھ کر اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی اور وہ کام کے متعلق کسی سے پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ اتنے میں ٹھیلے پر بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک نے اسے اپنے قریب کھڑا دیکھ کر بنگلہ زبان میں پوچھا،

"کی چاؤ بیٹا!" (کیا چاہتے ہو، بیٹا)

"کاج چائی! (کام چاہیئے)" اس نے بڑی نرمی سے بنگلہ ہی میں جواب دیا اور اس آدمی نے اسے اپنے قریب بلاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے مشورہ لیا۔ پھر اسے ایک روپے روز پر اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے رکھ لیا۔ اس آدمی نے کام کرنے کے سلسلے میں کوئی شرط نہ لگائی۔ ہاں! ٹھیک وقت پر سویرے پہنچ جانے کی تاکید ضرور کی۔ وہ خوش خوش اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

لیکن گھر پر اس کی ماں نہ تھی۔ اسے بڑا تاؤ آیا اور وہ ماں کو ڈھونڈنے نکل پڑا۔ دو تین گھروں میں، جہاں اس کی ماں کام کرتی تھی، گیا، مگر ماں نہ ملی۔ پھر وہ ماں کو ڈھونڈتا ہوا بشیر میاں کے گھر پہنچا۔ ان کے کمرے کی روشنی مدھم تھی اور کسی کے آہستہ بات کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس بار اس نے آواز نہ دی اور گھر واپس آ کر ماں کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی ماں آئی اور اسے گھر میں موجود دیکھ کر کچھ پریشان ہوئی، مگر اس نے ماں کو کچھ نہ کہا، البتہ یہ تاکید کر دی کہ اگر وہ آئندہ کسی کے گھر گئی تو وہ اس کے ساتھ نہیں رہے گا۔ پھر اس نے ماں کو کام ملنے کی خبر سنائی۔ ماں خوش ہوئی اور اسے گلے لگا لیا۔ اس بار اس نے خود وعدہ کیا کہ اب وہ کہیں کام کرنے

نہ جائے گی۔ماں کی باتیں سن کر اسے اطمینان ہو گیا۔

وہ برابر کام پر جاتا رہا۔دن بھر ٹھیلا چلانے کے بعد جب وہ شام کو گھر واپس آتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کے جسم کا جوڑ جوڑ الگ ہو گیا ہو۔شروع میں اسے یہ کام بڑا مشکل معلوم ہوا مگر پھر رفتہ رفتہ وہ عادی ہو گیا۔اس کا جسم محنت، دھوپ اور گرمی برداشت کرتے کرتے مضبوط ہوتا گیا۔اب اسے تھکن کا زیادہ احساس نہ ہوتا۔اتنی محنت کرنے پر بھی اگر وہ کبھی کام کرنے میں تھوڑی سستی کرتا یا دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں لگ جاتا تو اس کے دوسرے ساتھی اسے گالیاں دیتے، مگر وہ اتنا خیال نہ کرتا اور ہنسی مذاق سمجھ کر ٹال دیتا۔اسی طرح زندگی کے دن جیسے تیسے کٹتے رہے۔

ایک دن کسی بات پر اس کے ایک ساتھی سے اس کی تکرار ہو گئی۔بات بڑھتے بڑھتے گالم گلوچ تک پہنچ گئی اور اس کے ساتھی نے اسے ماں کی گالی دے دی بس اس نے کام چھوڑ دیا۔

سیندوری شام پر آہستہ آہستہ تاریکی کا غبار بیٹھ رہا تھا۔سڑک کے کنارے کھڑے بجلی کے کھمبے اپنی روشنی سے تاریکی کے دامن کو چاک کر رہے تھے۔درختوں سے دھواں سا نکلتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔اس اداس ماحول میں نورا بھی اداس تھا اور آئندہ کل کے بارے میں سوچتا ہوا گھر لوٹ رہا تھا۔وہ ماں سے کام چھوڑ دینے کے بارے میں کیسے بتائے گا اور پھر ماں کو اس طرح یک بیک کام چھوٹ جانے پر کتنا دکھ ہو گا۔ہو سکتا ہے اس کی ماں پھر لوگوں کے گھر کام کرنے کو کہے اور اس کو پھر طرح طرح کے طعنے سننے پڑیں، مگر وہ ماں کو کہیں کام کرنے نہ جانے دے گا۔وہ یہی سوچتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔غیر متوقع طور پر آج پھر اس کی ماں گھر پر نہ تھی۔ماں کو نہ پا کر اسے بڑا دکھ ہوا۔تھوڑی دیر تک وہ کھڑا سوچتا رہا۔اس کے ذہن میں لوگوں کے دیئے طعنے ہیجان پیدا کرتے رہے۔

"ابے! تیری ماں تو بشیر میاں سے پھنسی ہے۔"

"بشیر تو اسے اور اس کی ماں کو کپڑے دیتا ہے۔"

"سالے کے باپ کا بھی پتا نہیں۔"

"جیسی ماں ہے ویسا ہی باپ بھی رہا ہو گا۔"

اسی طرح کے مختلف جملے اس کے ذہن میں سوئیاں چبھوتے رہے اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پاگل ہو جائے گا۔اب وہ زیادہ دیر تک گھر میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔وہ گھر سے نکلنے کے

لئے مڑا ہی تھا کہ اتنے میں اس کی ماں آگئی۔ ماں کو دیکھتے ہی اس کے دکھ کا احساس اور بھی شدید ہو گیا، مگر اس نے ماں کو کچھ بھی نہ کہا اور گھر سے نکل گیا۔ وہ ماں جس کے لئے ہر طرح کی پریشانی اٹھانے کے لئے وہ تیار تھا۔ اسی ماں کو اس نے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ اسے اپنی ماں سے کتنی محبت تھی!

گھر چھوڑ کو وہ گلستان اور اسٹیڈیم کے اطراف میں اناناس کے قتلے بیچنے لگا۔ دن میں اسے خاصی آمدنی ہو جاتی۔ اپنے اس کام سے وہ خوش تھا، اس لئے کہ اس کام میں محنت بھی زیادہ نہ تھی اور کسی کی گالی بھی نہ سننی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے کھانے پینے کے لئے معقول پیسے بھی مل جاتے تھے پھر رفتہ رفتہ اس کی جان پہچان کریمو سے ہو گئی۔ وہ بھی اناناس کے قتلے بیچتا تھا۔ اس طرح وہ دونوں اچھے دوست ہو گئے اور ایک ساتھ رہنے لگے۔ اب وہ اپنے آپ کو اس بھری پری دنیا میں تنہا نہ محسوس کر رہا تھا۔

مگر آج جب وہ ٹیکسی اسٹینڈ سے گزر رہا تھا تو شمو نے کسی بات پر اسے ماں کی گالی دے دی اور وہ شمو سے الجھ پڑا۔ اگر بیچ بچاؤ نہ ہوتا تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔ وہ کافی رات تک یہی سب سوچتا رہا۔ اس کے ذہن میں رہ رہ کر شمو کی گالی کچوکے لگاتی رہی اور جب اس سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنے اردگرد ایک بار دیکھا۔ بتی کی لو ویسے ہی کم تھی اور چھوٹے سے کمرے میں بجھی بجھی سی روشنی پھیل رہی تھی۔ کریمو جانے کب آکر سو گیا تھا پھر وہ اٹھا.... اناناس کاٹنے والی چھری لی.... اور چپ چاپ دبے پاؤں کمرے سے نکل کر راستے پر ہو لیا۔ اس کا رخ شمو کے گھر کی طرف تھا۔

جب وہ شمو کے دروازے پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ دروازہ بند تھا اور کمرے کے اندر ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے دروازے کو دھکا دیا، مگر وہ اندر سے بند تھا۔ اس نے کھڑکی سے کسی طرح جھانک کر اندر دیکھا، لیکن مدھم روشنی میں اسے چہرے صاف نظر نہ آئے ہاں! اس نے اتنا ضرور دیکھا کہ ایک عورت چوکی پر لیٹی تھی اور اس کے پہلو میں ایک مرد بھی تھا وہ آپس میں ہولے ہولے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ باتیں تو اس کی سمجھ میں نہ آئیں، مگر اس نے آواز پہچان لی اور ایک دم ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی اور چھری اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔

(لیل و نہار۔ لاہور۔ ۱۹۶۳ء)

تیرگی کے دھاگے

وہ ہر روز تالاب کے کنارے بیٹھا پانی پر نقش بنایا کرتا۔

اس کا یہ روز کا معمول تھا۔ جب اسے اپنے کاموں سے فرصت ملتی، وہ اپنے گھر کے سامنے تالاب کے کنارے بیٹھ جاتا اور پانی میں کنکریاں پھینک پھینک کر لہریں گنا کرتا۔ لہریں ایک نقطے سے دائرہ بناتی ہوئی آہستہ آہستہ بڑھتیں اور پھیل کر پورے تالاب کو اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتیں، لیکن پانی میں پھیلے ہوئے جل کمبھی کے پودے جب لہروں کے بڑھنے میں رکاوٹ ڈالتے تو اسے بڑا غصہ آتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ تالاب میں کود پڑے اور تمام جل کمبھی کے پودوں کو نکال پھینکے۔ کئی بار اس نے ایسا کیا بھی تھا، مگر پودے تھے کہ روز بروز یوں بڑھتے اور پھیلتے جا رہے تھے جیسے تالاب کو کوئی روگ لگ گیا ہو۔

لہروں سے کھیلتے کھیلتے جب اس کا جی اکتا جاتا تو وہ اپنے سامنے حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے دھان اور پاٹ (پٹسن) کے کھیتوں کو دیکھنے لگتا۔ ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے پودے ہوا کے رخ پر گردن جھکا کر آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے معلوم ہوتے۔ ان کی سرسراہٹ کو سن کر ایسا محسوس ہوتا جیسے پورے ماحول میں نغمگی بکھر رہی ہو، لیکن آج تو یہ نغمگی اسے نوحہ معلوم ہو رہی تھی اور ہر پودا وہ کسان دکھائی دے رہا تھا جو ظلم و تشدد کے بوجھ تلے دبا کراہ رہا ہو، چیخ رہا ہو۔ کھیت جو امید کے پیکر ہوتے ہیں، پودے جو کسانوں کی آرزو ہوتے ہیں، کسان جو رزق کا وسیلہ ہوتا ہے، کراہ جو ظلم و تشدد کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ان ساری باتوں نے مل کر اس کے ذہن کو پراگندہ کر دیا تھا اور وہ شدید کرب کے عالم میں یہ سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کب تک اس کراہ کو سنتا رہے گا۔

ابھی وہ اتنا ہی سوچ سکا تھا کہ اتنے میں اس کے باپ احمد علی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"بیٹا رئیس! تالاب کی لہریں گن کر کیا کرو گے؟" تم نے کچھ سنا! آج بھی ملن بیوپاری آیا تھا

وہ گاؤں کے تمام لوگوں سے پاٹ اکٹھا کرنے کو کہہ گیا ہے۔ کل وہ پھر آئے گا۔ تم نے کچھ سوچا اب تک....."

"ہاں بابا! میں نے سوچ لیا ہے۔ اب وہ ہمارے گاؤں کا پاٹ نہیں لے جائے گا۔ ہم خود شہر لے جاکر بیچیں گے۔"

"مگر یہ سب کیسے ہوگا؟" احمد علی نے مجسم سوال بن کر پوچھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا بابا! ہمیں صرف روپوں کی ضرورت ہے تاکہ ہم اپنا پاٹ شہر تک لے جاسکیں۔ میں نے گاؤں کے کچھ لوگوں سے بات کرلی ہے۔ وہ ہمیں اپنا پاٹ دینے کو تیار ہیں۔ تم صرف روپوں کا انتظام کردو۔"

رئیس نے باپ کے قریب آکر کچھ اس انداز سے کہا جیسے اس کی آواز میں دل کی ساری آرزوئیں سمٹ آئی ہوں۔ پھر وہ دونوں کسی گہری سوچ میں ڈوبے گھر کی طرف ہولئے۔

شام کے سائے گہرے ہوتے جارہے تھے کھیتوں پر کہر کا نیلا غبار اڑنے لگا تھا۔ پیڑ پودے دن بھر ہوا کے مسلسل جھونکوں سے ٹکرانے کے بعد سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ بگلوں کا آخری جوڑا شور مچاتا ہوا محوِ پرواز تھا۔ ہر طرف ایک بڑا ہی اداس سناٹا پھیلتا جارہا تھا۔ گاؤں کی تاریک جھونپڑیاں لالٹین کی روشنیوں سے منور ہو رہی تھیں۔ ایسے میں وہ دونوں اپنے دل میں امید کی شمعیں روشن کئے گھر میں داخل ہوئے۔ پھول بیگم کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ کمرے میں مٹی کے تیل کی بو اور میلی میلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور مکمل خاموشی تھی۔ ہاں! البتہ بھات (چاول) پکنے کی کھد کھد اور ساگ کے سوں سوں کا شور مسلسل ابھر رہا تھا۔ اس بے کیف ماحول اور نیم تاریک کمرے میں بیٹھے وہ دونوں مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں الجھے ہوئے تھے۔

پھر تھوڑی ہی دیر بعد رئیس، احمد علی کو چھوڑ کر گاؤں کے ان لوگوں کے پاس چلا گیا جنہوں نے اسے پاٹ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے گاؤں کے بیشتر لوگوں کو سمجھا بجھا کر اپنا ہمخیال بنا لیا تھا۔ اس بار وہ ملن بیوپاری کو اپنا اور گاؤں والوں کا پاٹ نہ دینا چاہتا تھا، کیونکہ ملن گاؤں سے کم دام میں پاٹ خرید کر شہر میں زیادہ داموں بیچتا تھا اور کسانوں کو ان کی محنت سے بھی کم پیسے دے کر ٹرخا دیتا۔ رئیس اس بات کو جان گیا تھا، اسے ملن کی ساری چالبازی کا علم ہو گیا تھا۔ چنانچہ اب اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ خود کسانوں کا پاٹ گاؤں سے شہر لے جائے گا۔ یہ خیال اس کے دل میں اس لئے پیدا ہوا تھا کہ وہ کسانوں کو اس اندھیرے سے نکالنا چاہتا تھا جو رفتہ رفـ

ان کا مقدر بنتا جارہا تھا اور جس میں اسے ان کی گھٹی گھٹی سی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

پہلے تو رئیس کے اس ارادے سے کسانوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ ان میں سے بہتوں نے برا بھی مانا، مگر جب انہیں اصل صورتحال کا علم ہوا تو وہ رئیس کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے۔ پھر وہ فقیر محمد کے ہاں گیا جہاں شام کو حقہ پینے والوں کی منڈلی جما کرتی تھی۔ یہاں اس سے طرح طرح کے سوالات کئے گئے۔ ملن کے طرفداروں نے اس پر طنز کئے، اسے اس ارادے سے باز آجانے کی دھمکی دی، مگر اس کے قدم ذرا بھی نہ ڈگمگائے۔ تب فقیر محمد اور دوسرے بہت سے کسانوں نے اسے اپنی پوری حمایت کا یقین دلایا۔ پھر اس نے شہر کے بہت سے بیوپاریوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا،

"یہ بیوپاری، ہم سے کم دام میں پاٹ خریدتے ہیں اور شہر لے جاکر دوگنے تین گنے داموں بیچتے ہیں۔ اس طرح، ہمیں، ہماری محنت کا پورا پھل بھی نہیں ملتا۔ یہ بیوپاری جونک کی طرح چمٹے ہوئے، ہمارا خون چوس رہے ہیں۔ ہم دن بھر دھوپ میں جل کر کھیتوں میں کام کرتے ہیں، بارش میں بھیگتے ہیں اور طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہیں، پھر بھی، ہماری بہت ساری خواہشیں سسکتی ہی رہ جاتی ہیں۔ آخر، ہم کب تک ان کا ظلم سہتے رہیں گے؟...." یہ کہتے ہوئے اس کے تصور میں ملن بیوپاری تھا اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کی گردن اپنے ہاتھوں میں لے کر اتنی زور سے دبائے کہ اس کی آنکھیں ابل پڑیں، مگر یہ ممکن نہ تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ملن اس سے زیادہ طاقتور ہے، چنانچہ اس خیال کے آتے ہی وہ ایک بار پھر اداس ہو گیا۔ اس کی باتیں سن کر پہلے تو گاؤں والے کسی گہری سوچ میں گم ہوئے، پھر اچانک سب کی نظریں اس کے چہرے پر یوں جم گئیں جیسے یہ ساری باتیں ان کی سمجھ میں آگئی ہوں۔

رات گئے جب وہ گھر لوٹا تو احمد علی جاگ رہا تھا، لیکن پھول بیگم سو رہی تھی۔ اس نے باپ کے قریب جا کر بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا،

"روپوں کا انتظام ہوا بابا؟ میں نے سبھوں سے بات کرلی ہے۔ گاؤں والے میرے ساتھ ہیں۔ فکر کی بات نہیں۔"

بیٹے کی باتیں سن کر احمد علی یوں اٹھ بیٹھا جیسے اس کے پورے وجود میں نئی زندگی آگئی ہو اس نے بیٹے سے کہا،

"ہاں بیٹے! میں نے روپوں کا بندوبست کرلیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی بوڑھی آنکھوں

میں چمک سی آگئی تھی۔

پھر دونوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا اور دل میں ایک درخشاں صبح کی آرزو لئے سونے کی کوشش کرنے لگے، مگر آج خوشی کے جذبے سے دونوں کی نیندیں اچاٹ ہو گئی تھیں۔ انہیں صرف صبح کا انتظار تھا۔ بتی ابھی تک جل رہی تھی مگر، اس کی لو اب کمزور ہو چلی تھی۔ شاید تیل ختم ہو رہا تھا اور اس کی میلی میلی سی روشنی گھر کی تاریکی کو دور نہ کر پا رہی تھی۔ اندھیرے روشنی میں ملتے جا رہے تھے اور اس دھندلی روشنی میں پھول بیگم کا پھول سا چہرہ کسی گدلے پانی کا چاند نظر آ رہا تھا۔ وہ بڑی آسودگی کی نیند سو رہی تھی جیسے غریب کے پیٹ بھرے کی گہری نیند۔ رئیس کو ایک لمحے کے لئے پھول بیگم کی شادی کا خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ یہی تو ایک بہن ہے جو سراپا ارمان بن کر اس کے وجود پر چھا گئی ہے۔ اس کی دلی خواہش ہے کہ اس ارمان کو جلد سے جلد پورا کرلے۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی رچے، وہ مایوں بیٹھے، شہنائیاں بجیں اور وہ بڑی دھوم دھام سے بیاہی جائے، مگر پھر دوسرے ہی لمحے اسے گاؤں کی ساری بیٹیوں اور بہنوں کا خیال آیا۔ تب اس کے ذہن میں ذمے داریوں کا احساس اور بھی شدت اختیار کر گیا اور دل تڑپ اٹھا۔

وہ اسی کش مکش میں کافی رات تک جاگتا رہا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ کبھی وہ سوچتا کہ کہیں اس کا پہلا ہی قدم نہ ڈگمگا جائے، کہیں ملن اور اس کے طرفداروں کی مذموم کوششیں اس کی امیدوں پر پانی نہ پھیر دیں، مگر یہ خیال بھی عارضی ہوتا، کیونکہ شہر کے کئی بیوپاریوں سے اس کی اچھی جان پہچان تھی اور ان سے اسے غلط راہ دکھانے کی امید نہ تھی۔ دوسری جانب وہ یہ سوچتا کہ اب ملن بیوپاری اس کے باپ اور گاؤں کے دوسرے لوگوں کو دھوکا نہ دے سکے گا۔ تب ملن کے خلاف اس کے دل میں نفرت کی آگ سی بھڑک اٹھتی اور وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔

پھر وہ اسی ادھیڑبن میں مبتلا جانے کب سو گیا۔ صبح سویرے وہ گاؤں کے بیشتر لوگوں کا پاٹ لے کر جب شہر جا رہا تھا تو اس کا دل پانی کی لہروں پر ڈولتی ہوئی ناؤ کی مانند ہولے ہولے ڈول رہا تھا اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ گاؤں کے سارے دکھ درد سمیٹے شہر جا رہا ہو جہاں سے وہ خوشیاں بٹور کر لائے گا اور گاؤں والوں کے قدموں میں ڈھیر کر دے گا۔

وہ انہیں خیالوں میں گم تھا کہ سامنے ناؤ پر اسے ملن بیوپاری آتا دکھائی دیا۔ اس کا جی دھک سے ہو کر رہ گیا اور اسے یوں لگا جیسے چپو اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر پانی میں گر پڑا ہو۔

اس کے سارے جسم میں ایک انجانا سا خوف سما گیا۔ وہ سوچنے لگا اگر ملن نے کچھ پوچھا تو وہ اس کے سوالوں کا کیا جواب دے گا۔ اس خیال نے اسے اور بھی پریشان کر دیا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں گاؤں والوں کا خیال ابھرا جنہوں نے اسے بڑے عزم و حوصلے سے، ہمت بندھا کر رخصت کیا تھا وہ مطمئن ہو گیا۔ اب اس کے جسم میں ایک نئی طاقت آ گئی تھی اور چپو پر اس کے ہاتھوں کی گرفت پھر مضبوط ہو گئی تھی۔ ناؤ پانی کا سینہ چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ملن کی ناؤ لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اس کی نظریں اس کی ناؤ پر جمی ہوئی تھیں کہ اتنے میں ملن نے قریب آ کر اس سے پوچھا،

"رئیس! پاٹ لے کر کہاں جا رہے ہو؟"

"شہر جا رہا ہوں!" اس نے بڑے روکھے پن سے جواب دیا۔

"کیا یہ سارے گاؤں کا پاٹ ہے؟" ملن نے گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے جی میں آئی کہ "ہاں" کہہ دے، مگر پھر کچھ مصلحت سمجھتے ہوئے اس نے کہا،

"نہیں... بیوپاری! کچھ لوگوں کا ہے۔" لیکن اس کے جواب کے انداز سے ملن کو کچھ شبہ ہوا، لہذا اس نے مزید کوئی سوال نہ کیا اور چپ چاپ اپنی کشتی آگے بڑھا لی۔

رئیس کو معاً خیال آیا کہ اگر وہ ملن کو یہ بتا دیتا کہ یہ پاٹ تقریباً گاؤں بھر کا ہے تو ہو سکتا ہے وہ کوئی شرارت کرتا اور شہر واپس جا کر اسے پریشان کرتا۔ پھر تو اسے پاٹ بیچنے میں بڑی دشواری پیش آتی۔ اچھا ہی ہوا جو وہ مصلحت آمیز جھوٹ بول کر صاف نکل آیا۔ اب ملن جب گاؤں پہنچے گا تو اسے بڑی مایوسی ہو گی اور صرف اسے اپنے طرفداروں ہی کا پاٹ ملے گا۔ اس طرح اب وہ گاؤں والوں کو دھوکا نہ دے سکے گا۔ اس وقت اس کے جی میں ملن کے خلاف نفرت کے شدید جذبات ابھر رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے کامیابی نصیب ہو گئی تو گاؤں والوں کو ہمیشہ کے لئے ملن جیسے منافع خور بیوپاریوں سے نجات مل جائے گی اور کسانوں کی تمناؤں کے کتنے ہی دیرینہ خواب پورے ہو جائیں گے پھر یہ جل کمبھی کے پودے پانی پر کبھی نہ پھیلیں گے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک انجانی سی مسکراہٹ بکھر گئی اور اس کے ہاتھ بڑی تیزی سے چپو چلانے میں مصروف ہو گئے۔ اب اس کے سامنے روشنی ہی روشنی تھی اور وہ اس روشنی میں کسانوں کے دمکتے ہوئے چہرے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی خیال میں مگن شہر پہنچ گیا۔

گھاٹ پر ناؤ لگا کر اس نے دو ایک بیوپاریوں سے بات کی، مگر سودا طے نہ ہو سکا۔ سب

بازار بھاؤ سے بھی کم دام دینا چاہ رہے تھے ۔ بیوپاریوں کا یہ عالم دیکھ کر اسے بڑی مایوسی ہوئی ۔ معاً اسے خیال آیا کہ کہیں اس کا پہلا ہی قدم نہ ڈگمگا جائے ، کہیں گھاٹا نہ ہو جائے ۔ اگر ایسا ہوا تو وہ گاؤں والوں کو کیا منہ دکھائے گا تب تو وہ گاؤں بھی واپس نہ جا سکے گا ۔ سب اس پر تھوکیں گے ، ملامت کریں گے ۔ اس کے باپ احمد علی کو کتنا صدمہ ہو گا ۔ اس نے کتنی مشکل سے یہ روپے پھول بیگم کی شادی کے لئے جمع کئے تھے پھر تو اس کی شادی بھی نہ ہو سکے گی اور اس کے ساتھ ہی گاؤں کی ساری بہنیں اور بیٹیاں کنواری رہ جائیں گی ۔ یہ تمام باتیں ہوا کا ایک تیز جھونکا بن کر اس کے ذہن سے ٹکرائیں اور اس کا جی سن سے ہو کر رہ گیا ۔ اب اس کے قدم زمین پر لرزتے ہوئے پڑ رہے تھے ، مگر اس نے ہمت نہ ہاری ۔ وہ کچھ دوسرے جان پہچان کے بیوپاریوں کے پاس گیا ، ان سے مول تول کیا اور آخر کار ایک بیوپاری سے اس کا سودا طے ہو گیا ۔ اس نے بازار بھاؤ کے حساب سے ملن کا سارا پاٹ خرید لیا ۔ روپے لیتے وقت اسے ایسا لگا جیسے وہ ایک دم سے اندھیرے سے اجالے میں آگیا ہو ۔ خوشی کے ان جانے احساس سے اس کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے ۔ اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ سارے گاؤں والوں کو اپنے سینے سے بھینچ لے اور جب وہ گھر کی طرف لوٹ رہا تھا تو اتنا خوش تھا ، اتنا خوش کہ اس کے ہونٹوں پر بھٹیالی کے بول آپ ہی آپ تھر تھرانے لگے ،

"مانجھی رے.... مانجھی!"

جب وہ گاؤں پہنچا تو اندھیرے کافی گہرے ہو چکے تھے ۔ گاؤں والے بڑی بےچینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے ۔ احمد علی تو اس کے لئے بیقرار ہوا جا رہا تھا ۔ پھول بیگم نے خلافِ معمول آج جلد ہی کھانا پکا لیا تھا ۔ اسے دیکھ کر سارے گاؤں والے اس کے گرد جمع ہو گئے ۔ احمد علی نے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا ۔ فقیر محمد نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا ۔ سب کے چہرے فتح مندی کے احساس سے دمک اٹھے تھے ۔ ظلم اور استحصال کے خلاف یہ ان کی پہلی جدو جہد تھی جس کی کامیابی کے احساس سے آج پورا گاؤں اور تمام کسان سرشار تھے ۔ پھر لوگوں نے باتوں ہی باتوں میں اسے ملن کے متعلق بتایا کہ وہ گاؤں آیا تھا اور پاٹ نہ پا کر بہت خفا ہوا ۔ رئیس ان کی باتیں سن کر بہت خوش ہوا ۔ آج صحیح معنوں میں اسے اپنی کامیابی پر فخر محسوس ہو رہا تھا ۔ اس نے سوچا کہ کبھی کبھی خوشی کا ایک لمحہ بھی کتنے ذہنی کرب سے گزر کر میسر آتا ہے اور صدیوں کے غم پر یوں محیط ہو جاتا ہے مانو غم کی کوئی حقیقت ہی نہ ہو.... خوشی کا احساس ہی سب کچھ ہو ۔ ایسی خوشی کے لئے کسان تمام

عمر جد و جہد کرتا ہے ، اپنی پیشانی سے ٹپکے ہوئے پسینے سے دھرتی کی پیاس بجھاتا ہے ، کھیتوں کی مانگ میں سیندور بھرتا ہے تب کہیں جاکر اسے یہ انمول لمحہ میسر آتا ہے اور اس کے احساس میں ڈوب کر وہ اپنے سارے غم بھول جاتا ہے ۔ کسان بھی کتنا معصوم ہوتا ہے.... اپنی چھوٹی چھوٹی بے وقعت خوشیوں کی طرح معصوم!

رئیس کے ذہن میں آج کیسے کیسے مسرت آمیز لمحے آرہے تھے اور اس کی نگاہیں ایک پر مسرت اور تابناک مستقبل پر جمی ہوئی تھیں جہاں اسے اپنا گاؤں ایک مثالی گاؤں نظر آرہا تھا جس میں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں ۔ اس نے جن لوگوں سے پاٹ لئے تھے ، انہیں حساب کر کے روپے دیئے اور اپنے گھر واپس آیا ۔ آج گاؤں والوں کو اس حقیقت کا پتا چلا کہ شہر کے بیوپاری انہیں کس طرح لوٹ رہے ہیں ۔

اس شام فقیر محمد کے دروازے پر ہر روز سے زیادہ بھیڑ تھی ۔ لوگ ملن کے بارے میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں کر رہے تھے ۔ کوئی کہتا ،

" ملن ، ہمارے اچھے پاٹ میں معمولی سی خامی نکال کر کم پیسے دیتا ، کبھی ذرا سی نمی دیکھ کر وزن سے زیادہ لیتا اور کبھی تو روپے نہ ہونے کا بہانہ کر کے واپس لوٹا دینا چاہتا ، مگر ہمیں پیٹ کی آگ سے مجبور ہو کر اس کی خوشامد کرنی پڑتی تب کہیں جاکر بڑی منت سماجت کے بعد وہ بازار بھاؤ سے بھی کم داموں پاٹ خریدنے پر تیار ہوتا ہے اور روپے یوں دیتا ہے جیسے وہ ہماری محنت کا صلہ نہ دے رہا ہو بلکہ احسان کے طور پر بھیک دے رہا ہو ۔ " وہ یہ کہہ کر اداس ہو جاتا ۔ اتنے میں ایک اور آواز ابھرتی ،

" وہ خود ، ہمارے ہی دیئے ہوئے پاٹ کو پانی میں بھگو کر یا گانٹھ کے درمیان میں ریت بالو رکھ کر شہر کے بڑے بیوپاریوں کے ہاتھ بیچتا تاکہ اسے زیادہ وزن کے زیادہ پیسے مل سکیں ۔ "

" ہاں .... ہاں بھائی ! وہ صرف ہمیں کو دھوکا نہیں دیتا بلکہ شہر کے بڑے بڑے بیوپاریوں کو بھی چکما دے کر پیسے اینٹھتا " تیسرا بڑی حقارت سے ملن میں کیڑے نکالتا ۔

فقیر محمد یہ ساری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا ۔ اس نے لمبی سانس بھر کر کہا ،

" ارے ، بھائیو ! رئیس کا احسان مانو کہ اس نے ہمیں اندھیرے سے نکالا.... ورنہ ہم تو یہ سب کچھ جان کر بھی دھوکا کھا رہے تھے اور نہ جانے کب تک یہ دھوکا کھاتے رہتے ۔ " پھر سبھوں نے ایک آواز میں کہا ،

"رئیس تو ہمارے لئے فرشتہ ہے فرشتہ۔" اس طرح اس روز کافی رات گئے تک رئیس کے تذکرے ہوتے رہے۔

اب رئیس گاؤں والوں کی نگاہوں کا مرکز تھا۔ لوگ اسے اپنا پاٹ لاکر دینے لگے تھے۔ فصل تیار ہونے کے بعد رئیس کے ہاں دھلے ہوئے، نرم نرم، چمکیلے پاٹ کی ٹال لگ جاتی اور وہ بازار جاکر بیچ آتا۔ اب مشکل ہی سے کوئی بیوپاری اس گاؤں کا رخ کرتا۔ سب جان گئے تھے کہ انہیں اس گاؤں کا پاٹ نہ ملے گا، مگر ملن بیوپاری اب بھی پاٹ کی فصل تیار ہونے کے بعد آتا رہا۔ اس عرصے میں اس نے لوگوں کو اپنا ہمخیال بنانے کی بڑی کوششیں کیں، مگر کوئی بھی اس کی باتوں میں نہ آیا۔ ہاں! البتہ گاؤں میں اب بھی کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو اپنا پاٹ ملن ہی کو دیتے رہے۔ ان میں زیادہ تعداد اس کے طرفداروں کی تھی یا پھر طرفداروں کے شناساؤں کی، مگر اتنا ضرور تھا کہ کوئی بھی دل سے خوش نہ تھا۔

گاؤں والوں کے ساتھ ساتھ رئیس کی حالت بھی اچھی ہو گئی تھی۔ احمد علی کو پھول بیگم کی شادی کا خیال بری طرح ستانے لگا تھا۔ وہ بار بار رئیس سے اس کا ذکر کرتا، مگر وہ ٹال دیتا۔ اس کے پیش نظر تو صرف پھول بیگم ہی نہیں بلکہ گاؤں کی دوسری پھول جیسی بہنیں اور بیٹیاں بھی تھیں جن کی شادی اتنی ہی اہم اور ضروری تھی جتنی کہ پھول بیگم کی، لیکن باپ ہونے کے ناتے احمد علی کو اپنی بیٹی کی زیادہ فکر تھی، چنانچہ اس نے بیٹی کا رشتہ طے کر دیا اور خود ہی اس کے انتظامات کرنے لگا۔ رئیس خاموش تھا۔ ہاں! البتہ اسے بڑی شدت سے اگلی فصل کا انتظار تھا جس کے بعد ہی وہ بہن کو دھوم دھام سے رخصت کر سکتا تھا، مگر اسی زمانے میں سیلاب آگیا اور پھول بیگم کی شادی رک گئی۔ پاٹ کی فصل خراب ہو گئی اور بازار بھاؤ کافی چڑھ گیا مگر بیچارے کسانوں کے پاس تو پاٹ تھا ہی نہیں کہ وہ چڑھے ہوئے بازار بھاؤ سے فائدہ اٹھاتے۔ بس کچھ ہی لوگوں کی فصل سیلاب کی زد سے بچ رہی تھی جو رئیس کو ملی اور اس نے جیسے تیسے نقصان کی تلافی کی۔

مگر پھر دوسری فصل میں اتنا زیادہ پاٹ پیدا ہوا کہ بازار بھاؤ ایک دم گر گیا۔ رئیس نے پہلے سے بہت سارا پاٹ جمع کر رکھا تھا۔ اسے امید تھی کہ ایک نہ ایک دن دام ضرور چڑھے گا اور وہ اس سے پورا فائدہ اٹھائے گا، مگر ایسا نہ ہوا۔ اس کے گھر کے سامنے پاٹ کا ٹال لگ گیا تھا۔ بیچارے کسان امید لگائے بیٹھے تھے کہ کب بھاؤ چڑھے اور رئیس انہیں بہت سے روپے لاکر دے خود رئیس بیحد پریشان تھا۔ وہ ہر روز بازار کی خبر لیتا۔ کئی بار وہ خود بازار گیا اور اس نے شہر کے

بڑے بڑے بیوپاریوں سے پوچھا، مگر سب نے یہی کہا کہ بظاہر دام چڑھنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی اگر تمہارے پاس پاٹ ہے تو اسے فوراً نکال دو، کیونکہ بازار بھاؤ اور بھی گرے گا، لیکن اس نے ان کی ایک نہ سنی، اس لئے کہ اب تو اسے بھی اس بیوپار کا تھوڑا بہت تجربہ ہو گیا تھا۔ ادھر وہ گاؤں والوں کو سمجھاتا رہا کہ جب پاٹ دوسرے ملکوں کو بڑی مقدار میں جانے لگے گا تو بازار بھاؤ ضرور چڑھے گا، مگر جب گاؤں والوں نے اسے اپنی مجبوریوں سے تنگ آکر بہت پریشان کیا تو اس نے سب کو ان کے پاٹ کی قیمت دے دی اور خود بازار بھاؤ کے چڑھنے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ وہ روپے تھے جسے احمد علی نے اپنی بیٹی پھول بیگم کی شادی کے لئے بچار کھا تھا۔

ایک دن صبح کے وقت وہ بیٹھا شہر جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسے ملن بیوپاری آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ رئیس کے قریب آکر اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا،

"سنا تم نے! کل سے بازار بھاؤ اور بھی گر گیا ہے۔ ابھی اور بھی گرنے کی امید ہے۔ تم فوراً اپنا سارا پاٹ نکال دو، ورنہ تمہیں زبردست گھاٹا ہو گا۔"

پہلے تو اس نے ملن کی باتوں کو غور سے سنا اور سوچنے لگا کہ ملن ٹھیک ہی کہتا ہے، مگر پھر اسے خیال آیا کہ کہیں وہ بہکا نہ رہا ہو۔ بھلا اس کی باتوں کا کیا اعتبار! ہو سکتا ہے کل سے دام چڑھنے لگے۔ یہ سوچ کر بظاہر تو اس نے ملن کی باتوں پر دھیان نہ دیا، مگر عجیب کشمکش اور الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا تھا۔ پھر وہ خود شہر گیا اور واقعی ملن کے کہنے کے مطابق بازار بھاؤ گرا ہوا پایا۔ اب اسے یقین سا آگیا کہ پاٹ ضرور نکال دینا چاہئے۔ پھر اس نے بڑے دکھ سے سوچا کہ پھول بیگم کی شادی کیسے ہو گی، وہ بابا کو کیا منہ دکھائے گا، مگر اتنا بڑا گھاٹا بھی تو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے اس صدمے سے بابا کو کچھ ہو جائے۔ نہیں.... نہیں! ہمیں اپنا پاٹ نکال دینا چاہئے اور دوسرے ہی دن وہ تمام پاٹ لے کر شہر کے لئے روانہ ہو گیا۔

آج بری طرح اسے اپنا پہلا دن یاد آرہا تھا جب وہ اسی طرح پاٹ کشتی پر لادے شہر جا رہا تھا۔ اس کے دل میں کتنی امنگیں تھیں! وہ کتنا خوش تھا! اس کے ذہن میں کیسے کیسے مسرت آمیز خیالات آرہے تھے، مگر آج وہ بیحد اداس تھا۔ اس کے دل میں ایک انجانا سا خوف سما گیا تھا۔ متواتر گرتے ہوئے بازار بھاؤ نے تو اس کی ہمت ہی پست کر دی تھی۔ اب ہنسی بھی اس کے ہونٹوں کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ وہ صرف سوچتا کہ کہیں پھول بیگم کی شادی نہ رک جائے، کہیں اس غم میں

اس کے باپ احمد علی کو کچھ ہو نہ جائے اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ کہیں گاؤں والوں کے دل میں اس کی طرف سے کھوٹ نہ آجائے، لیکن چاہے کچھ بھی ہو، آج وہ ہر قیمت پر اپنا پاٹ ضرور نکال دے گا اور تمام روپے لاکر بابا کے ہاتھوں پر رکھ دے گا۔

پھر جب وہ بازار پہنچا تو اس نے سنا کہ بازار بھاؤ کل سے بھی زیادہ گر گیا ہے۔ یہ سن کر اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ پھر اسی گھبراہٹ میں اس نے اپنا سارا پاٹ بیچ دیا۔ کل رقم اسے اصل سے بھی کم ملی۔ روپے لیتے ہوئے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا لہو نچوڑ لیا ہو، مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ روپوں کو مٹھی میں بھینچ کر یوں لوٹ رہا تھا جیسے یہی اس کی زندگی کا آخری اثاثہ ہو۔ گھر پہنچ کر اس نے کل روپے بابا کے ہاتھوں پر رکھ دیئے اور گردن گھما کر جلدی سے باہر نکل چلا گیا جیسے وہ احمد علی سے نظریں ملانا نہ چاہ رہا ہو۔ وہ بوجھل قدم اٹھاتا ہوا آہستہ آہستہ اسی تالاب کی طرف جا رہا تھا جہاں جل کمبھی کے پودوں نے ایک بار پھر پورے تالاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا روشنی اندھیرے میں گم ہو چکی تھی اور تیرگی کے دھاگے دور تک پھیل رہے تھے۔

(چترالی۔ ڈھاکا / صریر کراچی۔ ۱۹۶۸ء / ۱۹۹۴ء)

دردکی فصیلیں

میں اس کہانی کا ٹوٹا ہوا سرا ڈھونڈ رہا ہوں، جو گولیوں کی سنسناہٹ میں گم ہو گیا ہے۔ میرے ذہن میں خیالات بادلوں کی مثال انجانی سمت کی جانب رواں ہیں۔ ہواؤں کا شور اچانک بڑھ گیا ہے، جیسے پھر کوئی طوفان آنے والا ہو۔ میں سہم جاتا ہوں۔

دل میں اداسیوں کا ہجوم لیے، میں ایئرپورٹ سے باہر آتا ہوں۔ شناسا چہروں کو ڈھونڈتا ہوں، مگر مایوسی ہوتی ہے۔ یہ شہر کبھی اپنا تھا۔ زندگی کی ساری چھوٹی بڑی خوشیاں، جانے انجانے غم اپنا نصیب تھے، آج اجنبی لگ رہا ہے۔ سب کچھ بدل گیا ہے۔ زمین اجنبی .... لوگ وہی، مگر شناخت بدلی ہوئی، چہرے پر تاسف آمیز کرب کی پرچھائیاں .... کل کی نسل آج جوان ہو چکی ہے، جو کبھی جوان تھی آج ڈھلتی دھوپ کی مانند بے حدت لگ رہی ہے۔ ان کا سب کچھ اپنا ہوتے ہوئے بھی اپنا نہیں لگتا۔ وہی بے چارگی، وہی دکھ، وہی غربت و افلاس، جیسے پچھتاوا ان کا مقدر ہو....!

"میر پور چلو....!" میں ٹیکسی ڈرائیو سے بنگلا زبان میں مخاطب ہوا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ایک تلخ، مگر مسرت آمیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کو چھو گئی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ فلائٹ کراچی سے آئی ہے۔ اس نے مزید کوئی استفسار نہ کیا۔ سب کچھ اس کی مسکراہٹ نے کہہ دیا تھا....!

فارم گیٹ پر پہنچ کر ٹیکسی چند لمحوں کے لیے رکی۔ ٹریفک بند تھا کہ اتنے میں اچانک میری نظر جہانگیر پر پڑی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔

"ہیلو .... ہیلو" کہتا ہوا وہ میری طرف بڑھا اور ٹیکسی ڈرائیور کو سائیڈ کرنے کا اشارہ کیا ٹیکسی رکتے ہی وہ اپنی کار سے اتر کر میری جانب لپکا۔ کرایہ ادا کرنے کے بعد وہ مجھ سے بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوا اور میرا سامان بغیر کچھ پوچھے اپنی کار کی ڈگی میں رکھنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ

میری خیریت بھی پوچھتا جارہا تھا۔ وہ بے حد خوش لگ رہا تھا۔ ایک دیرینہ دوست سے مل کر مجھے بھی خوشی ہورہی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد اس نے پوچھا،

"کہاں ٹھہروگے....؟"،

"میں میرپور جارہا ہوں۔ سکینہ میرا انتظار کررہی ہوگی۔" اس نے اصرار کیا،

"آج میرے یہاں ٹھہرو، کل چلے جانا...."

"نہیں! پھر کسی دن۔"

"اچھا بابا!".... میں تمھیں چھوڑدوں گا۔"

جہانگیر میرے اسکول کے زمانے کا ساتھی تھا۔ وہ بنگلا میڈیم میں پڑھتا تھا اور میں اردو میڈیم میں۔ اسکول ایک ہی تھا۔ اس وقت فاصلے نہیں بڑھے تھے، دل ایک ہی تھے۔ مگر پھر زمانہ بدلا۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ کالج میں داخل ہوگیا۔ انھیں دنوں دیش کی آزادی کی تحریک زوروں پر تھی اور بہت سی خفیہ تنظیمیں کالج کے طلبا کو مختلف کاموں کی تربیت دے رہی تھیں۔ وہ "مکتی باہنی" میں شامل ہوگیا۔ کچھ ہی دنوں بعد اس کے خیالات میں بڑی تبدیلی آگئی۔ اس زمانے میں وہ جب بھی ملتا، تو ایک فاصلہ رکھ کر ملتا۔ اس کے رویے سے نفرت کا اظہار ہوتا، گویا اس کے ذہن کو بدل دیا گیا ہو۔ وہ آزادی کے نشے میں سرشار تھا اور بری صحبت میں رہ کر بگڑ گیا تھا۔ اس کا حلیہ بڑا خوفناک تھا، اس لیے مجھے اس سے نفرت سی ہوگئی تھی، مگر آج وہ بڑے خلوص سے ملا، اس کا حلیہ بھی درست تھا۔ اس نے خود ہی کہا،

"ڈرو نہیں!.... پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ تم میرے دوست اور بچپن کے ساتھی ہو اور اس وقت میرے مہمان بھی۔ چلو! کچھ دیر رک کر چائے پیتے ہیں، پھر چلے جانا۔" میں سوچ رہا تھا.... ایک دم سے اتنی محبت اس میں کہاں سے آگئی....؟

"میرا گھر راستے ہی میں پڑے گا ایوب گیٹ میں" جہاں پہلے تم بھی رہا کرتے تھے، مگر اس کا نام اب بدل گیا ہے، میں اسی علاقے میں رہتا ہوں۔ پرانی یاد تازہ ہوجائے گی۔"

اب مجھ میں انکار کی ہمت نہ تھی۔ میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہولیا مگر ایک خیال مجھے بار بار شک میں مبتلا کررہا تھا، کہ اس نے شرافت کی زندگی کیسے اختیار کرلی اور تمام بری عادتوں کو اس نے کیسے چھوڑدیا۔ میں نے اس سے پوچھا،

"تم نے شادی کرلی؟" وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔

اس نے جس مکان کے آگے گاڑی روکی، اسے دیکھ کر مجھے یاد آیا، یہ مکان تو پہلے کسی صحافی کا تھا جو اب کراچی میں کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔

جہانگیر اس مکان میں تنہا رہتا ہے۔ اس کے ماں باپ گاؤں میں ہیں۔ اس کے خوب صورت ڈرائنگ روم میں چائے پیتے ہوئے میں سوچ رہا تھا، دنیا کتنی بدل گئی ہے! جن کے پاس کچھ بھی نہیں تھا آج بنا بنایا سب کچھ ان کا ہے، مگر غربت پھر بھی دور نہیں ہوئی۔ پھر میں نے اس سے اجازت چاہی۔ اس نے کہا،

"اتنی جلدی بھی کیا ہے! محمد پور دیکھ لو، شاید کوئی پرانا شناسا تمھارا ہم زبان مل جائے۔ اردو بولنے والے ابھی باقی ہیں۔" وہ سرسری سی بہ ظاہر غیر سیاسی باتیں کر رہا تھا، مگر مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ طنز کے تیر چلا رہا ہو۔ میرے ذہن سے پچھلی باتیں ابھی تک محو نہیں ہوئی تھیں اور حالات کی ہولناکی کا غبار دل میں تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا،

"تو گویا بھوبھل میں ابھی تک چنگاری باقی ہے۔" "ہاں شاید! مگر بڑی بے جان اور بے ضرر سی۔"،

"اسے تو ہوا ہی بجھا دے گی؟"

اس نے میرے بدلے ہوئے لہجے کی کربناکی کو محسوس کرتے ہوئے کہا،

"ارے! میں تو یوں ہی عام سی بات کر کے تمھاری یادوں کو آواز دے رہا تھا، تمھارے بہت سے لوگ وہاں رہتے تھے۔ کیا سب ہجرت کر گئے؟"

"ہاں شاید! اب میں جانا چاہتا ہوں، کوئی میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ شام کو چلیں گے۔ میں تو روز ہی کیمپ کے چکر لگاتا ہوں"

"لیکن میں اب ایک منٹ بھی نہیں رکوں گا، مجھے پریشانی ہو رہی ہے؟"

پھر میں اس کے ساتھ میرپور بہاری کیمپ کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں مجھے اس کی باتیں یاد آتی رہیں۔ "ابھی کچھ لوگ باقی ہیں "میرے ذہن میں دکھ کی سوئیاں چبھتی رہیں۔ مجھے وہ قافلے یاد آئے جو ایک گھر اور ایک منزل کی تلاش میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر یہاں آئے تھے، مگر وقت اور حالات نے انھیں یہاں بھی چین سے نہ رہنے دیا۔ اور وہ کسی اور منزل کی جانب نکل پڑے۔ کئی نسلیں تباہ ہو گئیں اور دربدری ان کا مقدر ٹھہرا۔ ایسا کیوں ہوا، اس سوال کا جواب کس کے پاس ہے؟

جہانگیر نے میری خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا،

"تم کس دنیا میں پہنچ گئے ہو؟ اب کیا سوچ رہے ہو، جب سب کچھ ختم ہو گیا؟"

"بس یوں ہی میرا ذہن شہید مینار کی طرف نکل گیا تھا اور میرا شہید دوست فیضو یاد آگیا تھا تم تو شاید اسے یاد بھی نہیں کرتے ہوگے .... سب کچھ مل جو گیا۔"

"نہیں! ایسا تو نہیں ہے۔۔ہم ہر سال شہید مینار پر اپنے شہیدوں کو پھول چڑھانے جاتے ہیں۔ انھیں کی قربانیوں کی بدولت تو آج ہم آزاد ہیں۔"

"میں بھی تو تمھارے ساتھ ننگے پاؤں جایا کرتا تھا، کیا تمھیں یاد نہیں؟"

"ہاں! یاد ہے۔! اس وقت تک تو سب کچھ ٹھیک تھا، پھر یہ اچانک اتنا بڑا طوفان کیسے آیا جس نے دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا؟"

"مٹی کی قسم کھانے والی سیاست نے، ہمیں ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ پھر فاصلے بڑھتے ہی رہے اور نتیجہ خون خرابے کی صورت میں نکلا اور پھر ایک بازو کٹ گیا۔"

"دلوں کی نفرتیں کب دور ہوں گی؟ پانی تو کافی گذر ہو چکا ہے۔"

"وقت تو لگے گا۔ کیا تم محسوس نہیں کر رہے ہو؟"

"ہاں! تمھارے رویے میں کچھ تبدیلی تو ضرور آئی ہے، شاید یہ میری دوستی کا اثر ہے یا پھر...."

"مگر عوام کا کیا حال ہے؟"

"ان کے جذبات بھی سرد پڑ چکے ہیں، لیکن انتقام کی آگ ابھی تک ٹھنڈی نہیں ہوئی شاید۔"

"اب وہ کس سے بدلہ لے رہے ہیں؟ ان مظلوموں سے، جو کیمپ میں زندگی اور موت کا انتظار کر رہے ہیں؟"

"ہاں! شاید .... اس لیے کہ انھوں نے آج تک ہماری آزادی کو قبول نہیں کیا"

"تم نے ان کی طرف محبت کا ہاتھ بھی تو نہیں بڑھایا۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو۔ آج تک وہ اسی سرزمین پر ہیں۔۔ہم تو کہتے ہیں کہ ہمارے ہو جاؤ، مگر وہ اپنی ضد پر قائم ہیں۔ وہیں جانا چاہتے ہیں جہاں سے تم آئے ہو؟"

"جہانگیر! تم شاید نہیں جانتے ہو کہ وہ اپنے آپ کو تاریخ سے جوڑے رکھنا چاہتے ہیں، وہ

جو ان کے پرکھوں نے اپنے خون سے لکھی تھی۔ اس میں تمہارے بزرگ بھی تو شامل تھے۔ مگر جذباتیت نے ہمیں کتنا دور کر دیا! اپنے درمیان کے تیسرے فریق کو ہم نے نہیں پہچانا، جس نے ہمیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور دلوں میں نفرتیں بھر دیں۔"

"تم بھی جذباتی ہو رہے ہو۔ وہ دیکھو! کیمپ نظر آرہا ہے، جہاں سکینہ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس سے مل کر مجھے بھول نہ جانا۔"

نہیں دوست! ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ ہمارے درمیان دوریاں ضرور حائل ہیں مگر دل ایک ہیں۔ ہم دینی بھائی بھی تو ہیں"

"سکینہ سے تم نے شادی کر لی تھی؟"

"ہاں! بس ہنگاموں سے چند ماہ قبل، مگر میں اسے ساتھ نہ لے جاسکا۔ وہ بچھڑ گئی تھی، مگر اب اس کا پتا چل گیا ہے اس نے مجھے خط بھی لکھا تھا۔ میں نے اس کی یاد میں دوسری شادی نہیں کی اور وہ بھی وفاشعار ہے۔"

"حیرت ہے! وہ اب تک تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ اسے تمہارے آنے کی خبر ہے؟"

"نہیں! میں اسے حیرت زدہ کرنا چاہتا ہوں .... ایک دم سے ڈھیر ساری خوشیاں دینا چاہتا ہوں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"ٹھیک ہے .... شاید وہ پہچان لے۔"

"شاید کیوں ....؟"

"حالات نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے۔ کوئی چیز بھی محفوظ نہیں۔"

"یعنی ....؟"

"ہاں! .... عزت، آبرو .... انسانی قدریں .... سب کچھ .... بڑی گھناؤنی زندگی لوگ بسر کر رہے ہیں۔ پیٹ کی خاطر سب کچھ ہو رہا ہے۔"

"میں اسے تلاش کرنے میں تمہاری مدد نہیں کر سکوں گا۔ مجھے جلدی لوٹنا ہے، پھر شام کو چند دوستوں کے ساتھ میرا ایک خاص پروگرام ہے۔ ویسے بھی لوگ مجھ سے خوف کھاتے ہیں۔؟"

وہ مجھے کیمپ سے ذرا دور چھوڑ کر چلا گیا۔ میں آہستہ آہستہ کیمپ کی جانب بڑھتا رہا۔ میرا ذہن سکینہ کی اس تحریر میں الجھ گیا تھا، جس میں اس نے لکھا تھا کہ آج کل وہ بالکل بے کار ہے، بڑی مشکلوں سے گزارہ ہو رہا ہے۔ زبان سیکھنے کے باوجود بھی وہ اس داغ کو نہ دھو سکی، جو

نفرت کی علامت بن گیا ہے۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے عورتوں کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ اس آخری جملے نے میرے قدم تیز کر دیے۔ ذہن میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو رہے تھے۔ کبھی خیال آتا۔ وہ کیمپ چھوڑ کر کہیں چلی نہ گئی ہو۔ اب تک اس نے اپنے آپ کو کیسے محفوظ رکھا ہو گا اس کے جاننے والے ساتھ ضرور رہتے ہیں، مگر وہ عورت بھی تو ہے۔

مجھے ابھی تک وہ کیمپ نہیں ملا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ لوگ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے، جیسے میں ان میں سے نہیں ہوں۔ کیمپ کی تنگ گلیوں سے گذرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ کچھ عورتیں صاف ستھرے لباس میں ملبوس، بال سنوارے، ان کاروں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہیں، جن کی تعداد میں اندھیرے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اور ایک بازار سا لگتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ کچھ مرد اور چند عورتیں دوڑ کر ان کاروں کی طرف بڑھتیں ہیں۔ کچھ سوال و جواب ہوتا ہے اور پھر گاڑی آگے بڑھ جاتی ہے۔ میں نے اس منظر کو دیکھا تو پہلی نظر میں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں سکینہ کا پتا پوچھنے کے لئے چند عورتوں سے مخاطب ہوا۔ انھوں نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے، مسکرا کر دیکھا .... جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ ان کی زبانیں قدرے مختلف ہو جانے کے باوجود مفہوم میری سمجھ میں آرہا تھا۔ ان کا رہن سہن اور بود و باش کتنا بدل گیا تھا! ایک ہی دیار اور ایک ہی قبیلے کے ہونے کے باوجود میں شاید ان کے لیے اجنبی تھا۔ میں نے بڑے دکھ سے سوچا .... وقت نے کس موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ان کے چہرے کی بے جان مسکراہٹوں میں ماضی، حال اور مستقبل کے دیے روشن تھے۔ ان کا اب کوئی بھی زمانہ نہیں۔ یہ درد کی کیسی داستان ہے، جس کا کوئی بھی سرا میرے ہاتھ نہیں آرہا ہے۔

میں آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور جا کر میں نے پھر ایک عورت سے سکینہ کے بارے میں پوچھا اور اسے بتایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں، اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ میری بیوی ہے۔ پاکستان کا نام سن کر اس کے چہرے پر بے شمار دیے جل گئے۔ اس کے پاس ہی کھڑے ہوئے بے یار و مددگار لوگ ٹھٹھک کر مجھے یوں دیکھنے لگے، جیسے وہ مجھ سے بہت سارے سوال کرنا چاہتے ہوں، اپنوں کی خیریت پوچھنا چاہتے ہوں اور اپنی منتقلی کی خبر سننے کے لیے بے چین ہوں .... مگر اس وقت ان کے سامنے میں خود ایک سوال بن گیا تھا۔ اس عورت نے کہا،

"آئیے میرے ساتھ ....!" وہ بہت خوش تھی۔ کچھ دور جا کر وہ ایک نیم تاریک سی گلی

میں داخل ہو گئی ۔ اور مجھے رکنے کا اشارہ کر کے خود آگے بڑھ گئی، شاید وہ سکینہ کو حیرت زدہ کرنا چاہتی تھی ۔ چند بے جان لمحے دم بخود گذر گئے ۔ خاموشی اور سناٹا ایسا تھا کہ دور کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی ۔ لالٹین کی زرد روشنی بڑی پر اسرار لگ رہی تھی ۔ بھیدوں بھری سرگوشیوں کے سلسلے دل میں خوف بھر رہے تھے ۔

اتنے میں میرے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی ....

"آج کے ایکٹی نوتن جینش دیکھابو .... ایک دم فریش، ان ٹچ!" ۔ (آج ایک بالکل نئی چیز دکھاؤں گا .... بالکل تازہ، اچھوئی!)

"کی بولو! ایکھنو فریش .... کو تھائے چھیلو .... ؟" (کیا بکتے ہو! اب تک کیسے اچھوئی اور تازہ ہے؟ آخر اب تک کہاں چھپی تھی؟) میں زبان سمجھتا تھا ۔ اس سرگوشی کو سن کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے میں کسی غلط جگہ آگیا ہوں ۔ ایک شخص میرے قریب سے گذر کر اسی طرف جانے لگا، جدھر وہ عورت گئی تھی ۔ اندھیرے میں، میں اسے پہچان نہ سکا ۔ میں اس عورت کا مزید انتظار کیے بغیر اسی سمت آگے بڑھ گیا ۔ ایک اندھیرے کمرے کے کھلے دروازے پر میرے قدم رک گئے ۔ ابھی میری آنکھیں اندھیرے کے مساوی بھی نہ ہو پائی تھیں کہ اتنے میں کمرے سے ایک سایہ بڑی سرعت سے میری جانب حملہ آور ہوا، جیسے کوئی اس کا شکار چھیننے آیا ہو ۔ میں سنبھل کر ایک طرف کو ہو لیا ۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور منہ کے بل زمین پر گر پڑا ۔ میں اس کی طرف لپکا ۔ وہ اٹھ چکا تھا، مگر اس کا ہاتھ میری گرفت میں آگیا ۔ میں نے اس کے ہاتھ سے ایک چمکتی ہوئی شے چھین کر اس کے پیٹ میں پیوست کر دی ۔ میں نے غیر ارادی طور پر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے میرا اپنا وجود مجسم درد بن گیا ہو .... سکینہ مجھ سے لپٹ گئی ۔ مگر کہانی کا ٹوٹا ہوا سرا ابھی تک میری دسترس سے باہر تھا ۔

صریر کراچی، ۱۹۹۶ء

درد کی چاندنی

"تمہاری یہ جھکی جھکی سی پلکیں، یہ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نرم نرم معصوم سے رخسار یہ ستواں ناک، یہ پتلے پتلے رس بھرے ہونٹ اور ان بیگناہ ہونٹوں پر رقص کرتی ہوئی یہ دلفریب مسکراہٹ کتنی توبہ شکن، کتنی جان لیوا اور کس قدر حسین ہے! جی چاہتا ہے زندگی کی کڑی دھوپ سے نکل کر تمہاری ان گھنی پلکوں کی چھاؤں میں چلا آؤں اور تم میرے شانوں پر اپنی دراز زلفیں بکھیرو اور میں تمہاری آغوش میں لیٹا سکھ کے سپنے دیکھا کروں۔ ٹھیک ہے نا رچنا!.... بولو۔ بولتی کیوں نہیں ہو؟...."

میں جذبات کی رو میں نہ جانے کیا کہتا چلا گیا اور وہ چپ چاپ کھڑی سفید کبوتر کے نرم نرم پروں پر ہلکے ہلکے ہاتھ پھیرتی رہی۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر وہی پیاری سی مسکراہٹ ابھی تک رقصاں تھی۔ پھر میں نے آہستہ سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چند لمحوں تک دیکھتا رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت دور سے کوئی آواز دے رہا ہو۔ بے اختیار میرا جی چاہا کہ میں اس کے ہونٹوں کو چوم کر گنہگار بن جاؤں اور جیسے ہی میں اس کی طرف بڑھا، اس نے بے اختیار ہنستے ہوئے اپنی گود کے کبوتر کو فضا میں اچھال دیا اور وہ پر پھڑپھڑاتا بوڑھے برگد کی جھکی ہوئی شاخ پر جا بیٹھا۔

میں رچنا کا ہاتھ پکڑ کر برگد کے نیچے تالاب کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ لجائی، شرمائی میرے قریب بیٹھی رہی۔ میں نے پھر کہا،

"تم کتنی حسین ہو رچنا!.... جیسے کسی مصور کا خیال، جیسے کسی شاعر کا خواب۔" میرے جواب میں اس نے ہلکے سے کہا تھا آپ کتنے اچھے ہیں!" اور مجھے محسوس ہوا جیسے میرے دل کے

مندر میں گھنٹیاں سی بج اٹھی ہوں۔ اس کے چہرے پر جذبات کی لہریں متلاطم تھیں اور میں ان لہروں میں بہتا ہوا دور چلا جا رہا تھا۔

شام کے سائے آہستہ آہستہ کھیتوں پر اتر رہے تھے۔ پرندوں کے غول اپنے اپنے گھونسلے کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔ بیلوں کی گھنٹی کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں اور اندھیرے، درختوں کی گھنی شاخوں میں منہ چھپانے لگے تھے۔ ہر طرف ایک گمبھیر خاموشی چھا گئی تھی۔ ہم دونوں تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیتے دنوں کی باتیں دہرا رہے تھے۔

رچنا سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب اسے میرے دفتر میں نئی نئی ملازمت ملی تھی۔ شروع میں وہ کچھ اس طرح لئے دیئے رہتی کہ اس سے کام کی بات کے علاوہ دوسری کوئی بات کرنے کی کسی میں ہمت نہ ہوتی۔ ویسے دفتر کا ہر شخص اس کے حسن کی جاذبیت سے متاثر نظر آتا اور ہنسنے مسکرانے کے موضوع کی تلاش میں رہتا، مگر وہ کسی کو ان باتوں کا موقع ہی نہ دیتی۔ بس اپنے کام سے کام رکھتی، لیکن میں اس معاملے میں اپنے آپ کو خوش قسمت ضرور سمجھتا ہوں کہ مجھے دن میں کئی بار اس سے کافی باتیں کرنے کا موقع مل جاتا، اس لئے کہ میرے دفتری کاموں کی نوعیت کچھ ایسی تھی جس کا تعلق براہِ راست رچنا سے تھا اور نئی ہونے کی وجہ سے اسے میری مدد لئے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ مجھ سے بے تکلف ہو گئی، لیکن اس کی بے تکلفی صرف مجھ ہی تک محدود تھی۔ دوسروں کے معاملہ میں وہ پہلے ہی جیسی الگ تھلگ رہی۔ اس بات سے دفتر کے دوسرے لوگوں میں آہستہ آہستہ سرگوشیاں ہونے لگیں، لیکن مجھے ان باتوں کی قطعی پروا نہ تھی۔ میں بس اپنے کام سے کام رکھتا اور ان تمام حضرات سے دور ہی رہتا جو میری طرف سے بھرے بیٹھے تھے۔

اس طرح دن آہستہ آہستہ گذرتے رہے۔ رچنا کی بے تکلفی بھی بڑھتی گئی اور دفتری لوگوں کی حسد و رقابت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ہم دونوں میں پہلے انسیت پیدا ہوئی اور پھر یہ انسیت دلوں میں گرہ بنتی چلی گئی۔ بظاہر ہم یوں ہنستے بولتے جیسے اس ہنسی اور گفتگو کا تعلق صرف دفتری کاموں سے ہے، مگر کیا معلوم تھا کہ دلوں میں پڑتی ہوئی انسیت کی گرہ سخت اور مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کسی روز گھریلو پریشانیوں کے باعث میرا موڈ خراب رہتا اور میں کسی سے بات نہ کرتا۔ رچنا اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کرتی۔ مجھے اداس دیکھ کر اس کے معمولات میں فرق آجاتا، لیکن وہ کوشش کرتی کہ میں محسوس نہ کروں۔ پھر بھی میں محسوس کر لیتا

اور اس طرح تھوڑے ہی عرصے میں، میں نے یہ محسوس کر لیا کہ اس کے دل میں میرے لئے کافی جگہ پیدا ہو گئی ہے، مگر ان تمام باتوں کے باوجود کسی میں بھی اظہار کی جرأت نہ تھی۔ کہنے کے لئے بہت کچھ تھا، مگر الفاظ نہ تھے۔ ہر روز سوچ کر جاتا کہ آج یہ یہ باتیں کریں گے، مگر سامنے جاتے ہی یوں لگتا جیسے بات کرنے کے لئے کوئی بات ہی نہیں، البتہ یہ محسوس ہوتا کہ میرے ذہن میں بہت سی باتیں محفوظ ہیں، مگر ان کے بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ بہت دنوں تک یہی کیفیت رہی۔ اس کا بھی یہی حال تھا، مگر دونوں کی زبان گنگ تھی۔ دونوں کے دل سلگ رہے تھے، مگر دھواں کسی کو بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

پھر وہ ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گاؤں چلی گئی۔ گاؤں میں اس کے کسی عزیز کی شادی ہونے والی تھی۔ جاتے ہوئے اس نے مجھے بھی آنے کی دعوت دی تھی، چنانچہ اس کے جانے کے دوسرے ہی روز، چھٹی لے کر میں بھی گاؤں پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ لوگ مجھ سے ناواقف ہونے کے ناتے اجنبیت برتیں گے، مگر حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے یہ دیکھا کہ انہوں نے مجھے گھر کے ایک فرد کی طرح سمجھا اور ویسے ہی میرا استقبال بھی کیا۔ میں بہت جلد ہی ان میں گھل مل گیا۔ رچنا نے میرے پہنچنے سے قبل ہی اپنے گھر والوں کو سب کچھ بتا دیا تھا سوائے ایک بات کے اور وہ بات بھی ایسی ہی تھی جو اپنے پیاروں سے بھی بڑے پس و پیش کے بعد بتائی جاتی ہے، حالانکہ اس بات کے سلسلے میں جتنی بھی احتیاط برتی جائے، اتنی ہی بے احتیاطی آپ ہی آپ ہو جاتی ہے۔ اس کے گھر والوں کے رویے میں اپنائیت دیکھ کر میں نے بھی اپنا رویہ ویسا ہی رکھا تا کہ انہیں کچھ محسوس نہ ہو۔ میرے اس رویے کا بڑا اچھا نتیجہ نکلا۔ میں رچنا سے بے جھجک گفتگو اور ہنسی مذاق کرتا، لیکن کسی کی پیشانی پر کبھی بل نہ پڑتا۔ مجھے تنہا ساتھ لے کر وہ اپنے گاؤں کے چپے چپے پر گھومتی پھرتی، مگر کسی کے تیور نہ بدلتے۔ گاؤں والوں کی فراخدلی اور وسیع النظری دیکھ کر مجھے شہر والوں کی تنگدلی اور تنگ نظری یاد آگئی اور میں نے سوچا گاؤں والوں کے دلوں میں آسمانوں کی سی وسعت اور فضاؤں کی سی کشادگی ہے۔ ان کے دل کنول کے پھولوں کی طرح نرم اور احساس کے آبگینوں کی طرح نازک ہوتے ہیں۔ کاش یہی فراخدلی اور وسیع النظری عام ہو جاتی اور گاؤں اور شہر کے دلوں کی تفریق مٹ جاتی اور انسانیت کے یہ اٹوٹ رشتے اور زیادہ مضبوط ہو جاتے!

اب شام کے اندھیرے کافی گہرے ہو گئے تھے۔ ہوا میں خنکی رچ گئی تھی اور آسمان پر شروع تاریخوں کا چاند روشن ہو گیا تھا۔ اس کی نور کی کرنیں کائنات پر پھیلی تاریکی کو دور کرنے

لگیں۔ہم دونوں کافی دیر تک بیٹھے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ کبھی کبھی کسی بات پر رچنا کی مترنم ہنسی خاموشی کا دل چیر جاتی۔ پھر ہم دونوں گھر واپس آجاتے۔

دوسرے ہی دن شادی تھی۔ گاؤں میں بڑی چہل پہل تھی اور تمام لوگ شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔شادی تو ایک گھر میں ہو رہی تھی، مگر ایسا لگتا تھا جیسے ہر گھر میں خوشیاں منائی جارہی ہوں اور ہر گھر میں شادی ہو رہی ہو۔یہ سب کچھ دلوں کی کشادگی کا نتیجہ تھا۔رچنا کی ماموں زاد بہن بیاہی جارہی تھی۔سب خوش تھے۔سب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمک رہے تھے۔کتنے دل انجانی خوشیوں سے لبریز تھے اور کتنے ہی دلوں میں آرزوئیں سلگ رہی تھیں۔ دل جل رہے تھے، مگر پھر بھی سب کے چہرے پر ایک سی کیفیت تھی، اس لئے کہ موقع خوشی کا تھا اور گاؤں کے ہر فرد کا خوش ہونا لازم تھا۔دلہن کی مانگ کی افشاں اور پیشانی کی کم کم دیکھ کر میں نے پاس ہی کھڑی ہوئی رچنا کے چٹکی لی۔ وہ کسمسا کر رہ گئی اور اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ میں نے مزید چھیڑنے کے لئے اس کے کان میں آہستہ سے کہا،

"تمہیں ایک دن ایسے ہی دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔" اور وہ ایک دم شرما کر بھاگ گئی۔ اس وقت میرے دل کا عجیب عالم تھا۔ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ دھڑکتے دھڑکتے رک جائے گا۔ احساس میں ایک طوفان برپا تھا۔ایک شور تھا کہ ہر لحظہ جذبات کی دنیا کو تہہ و بالا کئے دے رہا تھا۔

دلہن سب کو روتا ہوا چھوڑ کر ایک نئی دنیا بسانے چلی گئی اور میں شہر واپس آگیا۔رچنا نے کچھ دنوں کی چھٹی اور بڑھالی تھی۔ اس کا خط برابر میرے پاس آتا۔خط میں وہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی۔ اس کے ہر خط سے اس بات کا صاف پتہ چلتا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں بھی اس کے لئے بیچین رہتا۔میری زندگی کا حاصل رچنا تھی۔ میں جلد سے جلد اس سے شادی کر لینا چاہتا تھا، اس لئے کہ میری زندگی کے چمن میں رچنا ایک ایسا پھول تھی جس سے اس کا گوشہ گوشہ معطر ہو گیا تھا۔

دن گزرتے رہے دل میں آرزوؤں کا ہجوم بڑھتا رہا۔نظروں کے سامنے خواب کے سے حسین حسین منظر پھرتے رہے۔ کانوں میں شہنائیوں کی آوازیں آتی رہیں۔ ذہن رنگین خیالوں سے منور ہوتا رہا اور ایک دن رچنا کا گاؤں سے تار موصول ہوا جس میں اس کی ماں کی نازک حالت کا ذکر تھا اور اسے فوراً آنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اس خبر کو پاکر ہم سب پریشان تھے۔ کچھ میں نہیں

آتا تھا کہ آخر یک بیک یہ کیا ہو گیا۔ وہ اسی روز گاؤں چلی گئی۔ پھر تین چار روز کے بعد اس کا خط آیا اور ساتھ ہی استعفیٰ بھی! اس نے مختصراً لکھا تھا:

"چند ناگزیر حالات کے پیش نظر میں ملازمت چھوڑ رہی ہوں۔ ماں کی طبیعت اب ٹھیک ہے، مگر وہ مجھے اپنی نظروں سے دور نہیں رہنے دینا چاہتیں، اس لئے مجبوراً میں استعفیٰ دے رہی ہوں۔ تمہیں برابر خط لکھتی رہوں گی۔ تم فکر مند نہ ہونا۔"

خط پا کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے پوری کائنات گھوم رہی ہو اور زمین کی گردش بڑھ گئی ہو۔ کوشش کے باوجود بھی ضبط نہ کر سکا۔ بے اختیار میری آنکھیں بھر آئیں اور میز سے سر ٹیک کر میں خوب رویا۔ میرے آنسو زمین کی آغوش میں چپکے چپکے جذب ہوتے رہے۔ پھر میں نے سنا کہ ہلکی ہلکی سرگوشیاں تیز ہوتی جا رہی ہیں اور ہنسی کی آواز لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہے اور اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پورا دفتر قہقہہ مار کر ہنس رہا ہو۔ جیسے جیسے آوازیں تیز ہوتی جا رہی تھیں، ویسے ویسے میرا ذہن پاگل ہوا جا رہا تھا۔

پھر میں دفتر سے گھر بھاگ آیا اور خوب رویا.... اتنا کہ میری ہچکیاں بندھ گئیں اور میں کئی روز تک دفتر نہ گیا۔ جب بھی دفتر کا خیال آتا۔ مجھے ایسا لگتا جیسے اب بھی میرے کانوں میں دفتر کے قہقہے گونج رہے ہوں اور سب میری لٹی ہوئی خوشیوں کا جشن منا رہے ہوں۔ میں آہستہ آہستہ اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کام میں میری طبیعت بالکل نہ لگتی۔ دفتر میں جیسے تیسے وقت گزار کر گھر آ جاتا۔ ساری دلچسپیاں ختم ہو گئی تھیں۔ دل میں کوئی خوشی باقی نہ رہ گئی تھی۔ بس اب رچنا کے خط کا انتظار رہتا۔ لیکن کئی روز گزرنے کے باوجود ابھی تک اس کا کوئی دوسرا خط نہیں آیا تھا، اس لئے اور بھی بےچینی تھی۔ دفتر میں بیٹھے ہوئے جب بھی اس کی سیٹ کی طرف نظر جاتی، بے اختیار آنکھیں بھر آتیں اور جی چاہتا کہ میز کرسی سے لپٹ کر خوب روؤں.... اتنا کہ میری رونے کی آواز سے پورے دفتر میں ایک کہرام مچ جائے اور ہنسنے والوں کے گلے بھی رندھ جائیں، مگر دنیا کو کسی کے غم کا کیا احساس ہو سکتا ہے۔

کئی روز کے بعد رچنا کا ایک دوسرا خط مجھے ملا۔ خلافِ توقع وہ بھی مختصر تھا: لکھا تھا،

"کس منہ سے تمہیں یہ بتاؤں کہ میری شادی ہو رہی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم اس خبر کی تاب نہ لا سکو گے۔ تمہارے دل پر جو کچھ بیتے گی، مجھے اس کا بھی علم ہے، مگر میں مجبور ہوں۔ ماں کی آخری خواہش کے آگے مجھے سرِ تسلیم خم کر دینا پڑا۔ جی تو چاہتا ہے کہ سارے ناتے توڑ کر تمہاری

آغوش میں پہنچ جاؤں، مگر پھر خیال آتا ہے دنیا تو سنور جائے گی لیکن عاقبت بگڑ جائے گی اور پھر میری ایک ذرا سی سرکشی سے والدین کی جان پر بن جائے گی۔ میں تمہیں کبھی نہ بھول سکوں گی۔ شادی تو میرے جسم کی ہو رہی ہے، لیکن روح ہمیشہ تمہاری رہے گی۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دو اور خدارا! رو رو کر میری محبت کو رسوا نہ کرنا ورنہ میری روح قیامت تک تم سے ایک سوال کرتی رہے گی۔"

اس خط کو پا کر میری جو کیفیت ہوئی، اس کا اندازہ میرے سوا اور کون کر سکتا ہے۔ دل ٹوٹ گیا تھا اور احساس جیسے جذبے سے خالی ہو گیا تھا۔ اندھیرا مقدر بن گیا تھا۔ اس غم کے بوجھ کو سہارنے کے لئے آنسو بھی نہ تھے۔ خاموش بیٹھا اندھیرے کو گھورتا رہتا.... اور محسوس ہوتا جیسے در و دیوار بھی حسرت بھری نگاہوں سے مجھے تک رہے ہوں۔ مجھے اس کی شادی میں شریک ہونے تک کا ہوش نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ حوصلہ کہاں سے لاتا۔

اس واقعے کو ہوئے آج کئی برس گزر گئے ہیں۔ وقت بدل گیا، دنیا بدل گئی، دل بدل گئے۔ حالات میں کتنے ہی مد و جزر آئے، دل کی دنیا میں کتنے ہی انقلاب برپا ہوئے..... مگر آج بھی تصور کو رچنا کی یادوں سے سجا رکھا ہے، اس لئے کہ یادیں ہی تو میری زندگی ہیں۔ انہیں کے سہارے تو میں نے جینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہی میری اندھیری زندگی کی شمعیں ہیں اور میرے دل کے تاریک راستے انہیں سے منور ہیں۔ اس عرصے میں رچنا نے پتا نہیں کس خیال کے ماتحت شادی کی تصویر بھیجی تھی جسے میں نے آج تک سینے سے لگا رکھا ہے۔ یہ تصویر اسے نہ بھیجنی چاہئے تھی، لیکن اس نے شاید اس خیال سے بھیج دیا کہ میں اسے دلہن کے روپ میں دیکھ لوں، کیونکہ ایک موقع پر میں نے اس سے کہا تھا کہ میں اسے دلہن بنا کر لے جاؤں گا اور میں نے بھی اسی لئے اپنے پاس محفوظ رکھا ہے۔ وہ میری دلہن نہ بن سکی تو کیا، دلہن کی صورت میں میرے سامنے تو موجود ہے۔ میں اس کی جھکی جھکی سی پلکیں، اس کے گلاب کی پنکھڑیوں کے سے نرم نرم معصوم سے رخسار، اس کی ستواں ناک، پتلے پتلے رس بھرے ہونٹ اور اس پر رقص کرتی ہوئی دلفریب مسکراہٹ اور ماتھے پر کم کم، یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ یہی کچھ میں نے اس سے پہلے بھی دیکھا تھا جب وہ دلہن نہیں بنی تھی اور اس کی گود میں لال لال آنکھوں والا سفید کبوتر تھا، لیکن آج وہ دلہن بنی آئینے کے سامنے کھڑی ہے اور اس کی گود میں کبوتر کی جگہ گڑیا ہے۔ وہ اس بے جان گڑیا کو اس محویت سے دیکھ رہی ہے، گویا دیکھتے دیکھتے وہ اس میں زندگی کی لہر دوڑا دے گی اور کپڑے کے

چیتھڑوں کی بنی ہوئی یہ گڑیا گوشت پوست کے منے میں تبدیل ہو جائے گی ۔ سرد راتوں کا چاند آسمان کی وسعتوں میں اپنا سفر طے کر رہا ہے ۔ پوری کائنات میں کہر آلود چاندنی کا غبار اڑ رہا ہے ۔ درختوں سے لپٹے ہوئے اندھیروں میں پر اسرار سرگوشیاں سرسرا رہی ہیں عمارتوں کے ہیولے بھولی بسری یادوں کی طرح مٹے مٹے سے دکھائی دے رہے ہیں ۔ میں لیمپ کی روشنی میں کافی دیر سے رچنا کی تصویر کو غور سے دیکھ رہا ہوں ۔ میرے ذہن میں یادوں کے جھکڑ چلنے لگے ہیں ۔ میرا سکون لٹ رہا ہے ۔ چاند کھڑکی میں آگیا ہے ۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن اس کی زبان خاموش ہے ۔ میری نظریں تصویر سے ہٹ کر چاند پر جم گئی ہیں ۔ پتا نہیں چاند اب کیوں مجھے دھندلا دھندلا نظر آرہا ہے ۔ شاید یادوں کا ہجوم پلکوں تک آگیا ہے ۔ کئی ماہ بعد اس کا مختصر خط ملا:

" تم شاید مجھے بھول چکے ہو، مگر میں نے تمہاری یاد کو زندہ رکھنے کے لئے اپنے منے کا نام تمہارے نام سے شروع ہونے والے حرف پر رکھا ہے اس کا باپ ہماری محبت کے شبہے کی بنیاد پر مجھے چھوڑ کر بہت دور جا چکا ہے، مگر مجھے اس کا غم نہیں ۔ تم اب ہمیشہ میرے خیالوں میں، میرے پاس رہو گے ۔ خدارا اب شادی کر لو ۔ اپنی پسند اور مرضی کی ۔ یہ میری تم سے آخری التجا ہے ۔"

(جوئباد ۔ ڈھاکہ ۔ ۱۹۶۴ء)

مجذوبؒ کی بڑ

"سنا تم نے! میری بیوی مجھے پاگل کہتی ہے۔"

"اچھا!"

"ہاں!"

"غلط کہتی ہے.... بالکل غلط۔"

"ہے نا! تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم بہت اچھے ہو۔ کبھی کبھی میں بھی اپنے بارے میں یہی سوچتا ہوں کہ میں بہت اچھا ہوں، مگر میری بیوی.... شاید وہ خود پاگل ہو گئی ہے، پر وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے.... دنیا کی تمام عورتوں سے اچھی۔"

"اور وہ تمہاری بیٹی؟"

"وہ! وہ تو اپنی ماں سے بھی اچھی ہے، مگر وہ مجھ سے اکثر روٹھ جاتی ہے.... اور جب وہ روٹھ جاتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے میری نظروں میں ساری دنیا تاریک ہو گئی ہو، کیونکہ میں اسے بے انتہا چاہتا ہوں.... اس کی ماں سے بھی زیادہ، پر وہ کمبخت اپنی ماں پر گئی ہے۔"

"ارے ہاں! تم کہاں جا رہے ہو؟"

"یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم.... ہاں ہاں! یاد آیا، کل عید ہے نا! میں اپنی بیٹی لاجو کے لئے اچھے اچھے کپڑے خریدنے جا رہا ہوں۔ بیوی نے بھی ایک ساڑی کی فرمائش کی ہے۔ پتا نہیں اسے یہ کہنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ میں تو خود اس کے لئے ایک اچھی سی ساڑی لے جاتا.... اپنی انگوٹھی بیچ کر۔"

"کیا کہا! انگوٹھی بیچ کر؟"

"ہاں ہاں! وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے نا۔"

"کیا تمہیں تنخواہ نہیں ملی۔"

"تنخواہ!....ہاہاہا!عید کی خوشی کے لئے آدھی تنخواہ تو ملی تھی...."

"پھر؟"

"پھر کیا!.... ختم ہو گئی۔"

"اچھا!وہ کیسے؟"

"ارے بھائی! مکان کا کرایہ، گھر کے اخراجات، عید کی مارکیٹنگ اور پھر بیٹی کے کپڑے .... وہ تو تم آج خریدنے جارہے ہو۔"

"ہاں ہاں دیکھو نا! اتنے ہی تو روپے ہیں اور بیوی نے بھی کپڑے کی فرمائش کی ہے، مگر میں انہیں روپوں سے اپنی بیٹی کے لئے خوب اچھے اچھے کپڑے لے جاؤں گا بالکل اس عورت کی طرح.... وہ.... وہ جو کار میں بیٹھی ہے!.... اچھا! یہ کار کتنے کی ہو گی؟"

"پتا نہیں۔"

"میں جا کر پوچھوں!"

"نہیں نہیں! وہ برا مان جائے گی۔"

"تو کیا ہوا! گالی تو نہ دے گی۔"

"ہو سکتا ہے گالی بھی دے۔"

"پھر تو مزہ آجائے گا۔"

"نہیں بھائی! میں چلا۔"

"ارے ٹھہرو نا! میں تمہیں اپنے ایک دوست سے ملاؤں گا۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"یہیں! اسٹیڈیم کے صدر دروازے کے قریب۔"

"کیا وہ تمہارا انتظار کر رہا ہو گا؟"

"ہاں! بس یہی سمجھو۔ وہ تو سب کا انتظار کرتا ہے اور اب تو انتظار ہی اس کی زندگی ہے۔ بڑا دکھی ہے میرا دوست۔"

"شاید عشق میں ناکامی ہوئی ہو گی!"

"ہاں! یہی کچھ بات ہے۔"

"تو تم کیوں اداس ہو گئے؟"

"نہیں تو!"

"تم نے بھی شاید عشق کیا ہے۔"

"نہیں تو!"

"تم مجھ سے چھپا رہے ہو.... اور مجھ سے چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا تم مجھے اپنا دوست نہیں سمجھتے؟"

"ایسی بات تو نہیں۔ عشق کون نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے میں نے بھی عشق کیا ہو۔"

"تو پھر بتاتے کیوں نہیں کہ تم نے کس سے عشق کیا ہے۔"

"تم میری کہانی لکھو گے؟"

"کیوں نہیں! مگر تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ تو سہی۔"

"کیا کہانی لکھنے کے لئے کچھ بتانا ضروری ہے؟"

"ضروری تو نہیں، مگر پھر بھی کچھ بنیاد تو ہو۔"

"دیکھو نا! میری بیوی مجھے پاگل کہتی ہے۔ میں تو اچھا خاصا ہوں۔ روزانہ دفتر جاتا ہوں۔ بیٹی کے لئے اچھی اچھی چیزیں بھی لے جاتا ہوں۔ اس سے بے پناہ محبت بھی کرتا ہوں، البتہ سارا سارا دن اور آدھی آدھی رات تک گھومتا رہتا ہوں۔ پتا نہیں مجھے نیند کیوں نہیں آتی۔"

"مگر یہ تو اچھا نہیں۔ تم جلدی گھر جایا کرو، پھر تمہاری بیوی تم سے بہت پیار کرے گی۔"

"گھر جا کر کیا کروں گا۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میرا پڑوسی نورو ہے نا! ہر وقت گھر میں گھسا رہتا ہے۔ اس نے حال ہی میں اپنی بھابی سے شادی کی ہے۔ بھائی دق کا مریض تھا مر گیا، پر وہ بڑی جاندار عورت ہے جب ہی تو نورو اس پر ریجھ گیا، مگر نورو مجھے اچھا نہیں لگتا اور اس کی بیوی ہے کہ اس سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔"

"تمہاری بیوی بھی تو تم سے محبت کرتی ہو گی۔"

"ہاں! کبھی کیا کرتی تھی، مگر اب تو وہ پاگل کہتی ہے۔"

"پیار سے کہتی ہو گی۔"

"کیا بیویاں پیار سے شوہر کو پاگل بھی کہتی ہیں؟"

"کیوں نہیں!"

" تو وہ مجھ سے ضرور پیار کرتی ہے! اب میں ہر وقت اسی کے پاس رہا کروں گا، مگر مجھے فٹبال کا کھیل اور اسٹیڈیم کے آس پاس.... یہی آدمجی کورٹ ہے نا! اور اس کے سامنے ایک لمبی چوڑی سی سڑک ہے جو ڈی۔ آئی۔ ٹی۔ ایونیو سے ہو کر آبزرور ہاؤس اور " دینک " پاکستان کی عمارت کے بیچ سے گذرتی ہے۔"

"ہاں ہاں! میں جانتا ہوں۔"

" اور پھر اسی کی ایک شاخ اسٹیڈیم کی طرف چلی جاتی ہے۔ اس کے داہنی طرف جو چھوٹا سا میدان ہے، اس میں طرح طرح کے سامان بیچنے والے جو تماشا دکھاتے ہیں اور ایک بوڑھا گیروا لباس پہنے بنجو بجا بجا کر گانا گاتا ہے، پھر اسی سڑک کے کنارے سلاجیت بیچنے والے سلاجیت کی خوبیاں بیان کر کے نوجوانوں کو اس کے استعمال پر مجبور کرتے ہیں۔ ہے نا!.... ہاں! تو میں یہ کھیل تماشے بڑے شوق سے دیکھتا ہوں اور سلاجیت والوں کے لکچر سنتا ہوں۔ وہ اپنی پشتو زبان میں عجیب عجیب انداز سے بولتا ہے اور ایک چھڑی کی مدد سے اس نقشے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس پر ایک اونچا سا پہاڑ بنا ہوتا ہے اور اس پر سانپ، بندر، بچھو، بھالو اور شیر کی تصویریں بنی ہوتی ہیں اور پگڑی باندھے ہوئے، ہاتھ میں بندوق لئے ہوئے پشاوری جس کا نام قوت خان ہے، ان خونخوار جانوروں کے درمیان سے گذرتا ہے، پھر سلاجیت حاصل کرتا ہے، سلاجیت کا سفوف پانی میں گھول کر اس کا لعاب دکھاتا ہے اور ایک روپے میں سلاجیت کی ایک پڑیا کمزور نوجوان کو تھما دیتا ہے۔ میں اس کے لکچر خوب مزے لے لے کر سنتا ہوں اور ان نوجوانوں کو دیکھتا ہوں جو اندھیرا ہونے کے بعد جھجکتے ہوئے، شرماتے ہوئے اسے خریدتے ہیں۔ اور جلدی سے جیب میں رکھ کر اپنی راہ لیتے ہیں۔ میں انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر سوچتا ہوں شاید یہ بھی پاگل ہیں۔ پاگل نہ ہوتے تو اس پشاوری خان کی بات میں کیوں آتے۔ بھلا سلاجیت کھانے سے کیا ہوتا ہے! تم نے بھی کھایا ہے کبھی؟"

"نہیں تو!"

" پھر لوگ اسے اندھیرے ہی میں کیوں خریدتے ہیں؟ کبھی کبھی تو میرا بھی جی چاہتا ہے کہ اسے اجالے میں خریدوں اور اندھیرے میں کھا کر دیکھوں کہ آخر اس میں کیا گن ہوتے ہیں، لیکن مجھے کیا ضرورت ہے۔ وہ لوگ پاگل ہیں جو اسے خریدتے ہیں۔ میں پاگل نہیں ہوں، پھر بھی میری بیوی مجھے پاگل کہتی ہے۔ وہ بھی عجیب پاگل ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وہ سچ پاگل نہ ہو

جائے ۔ پھر تو اسے پاگل خانے لے جانا ہو گا، مگر بیٹی لاجو کہاں رہے گی ؟ وہ تو اب کافی بڑی ہو گئی ہے ۔بہت خوبصورت ہے اپنی ماں کی طرح ۔"

"تم کہاں جا رہے تھے ؟ تم نے تو عید کے لئے بہت اچھے اچھے کپڑے خریدے ہوں گے ۔ تمہاری بیوی بڑی خوبصورت ہے نا!"

"میں نے تو شادی ہی نہیں کی ۔"

"اچھا!"

"میرے دوست سے ملو گے نا!"

"کیوں نہیں!"

"اس کی کہانی بھی لکھو گے نا!"

"پہلے ملاؤ تو سہی!"

"وہ بہت اچھا آدمی ہے، پر اب تو وہ کسی سے بولتا ہی نہیں.... بس مسکراتا ہے ۔ کھانا بھی نہیں مانگتا ۔ وہ بہت خوبصورت ہے میری ہی طرح ۔ میں خوبصورت ہوں نا وہ بہت تندرست ہے ۔ کل آفس میں بہت کام تھا ۔آفس والے مجھ پر ہنستے ہیں ۔ میں تو ان سے بولتا بھی نہیں.... بس ٹائپ کرتا ہوں ۔ ٹائپ رائٹر کی آواز مجھے بہت اچھی لگتی ہے..... ٹپ..... ٹپ.... ٹپ ٹپاٹپ ۔"

"ارے ہاں! ایک روز بڑا مزہ آیا ۔ میرے ہیڈ کلرک صاحب قریب آئے اور پتا نہیں کیوں زور سے ہنسنے لگے ۔ انہیں دیکھ کر میں بھی ہنسنے لگا ۔ وہ چپ ہو گئے ۔ میں بھی چپ ہو گیا ۔ انہوں نے پوچھا کہ میں کیوں ہنسا اور میں نے بھی پوچھا کہ وہ کیوں ہنسے ۔ ارے پاگل! میں تو اس لئے ہنسا تھا کہ تم ٹائپ رائٹر پر کاغذ لگائے بغیر ٹائپ کر رہے تھے ۔ تب میں بہت شرمندہ ہوا تھا، مگر انہوں نے مجھے پاگل کیوں کہا تھا ؟ میں ایک دم اداس ہو گیا تھا، کیونکہ میری بیوی بھی مجھے پاگل کہتی ہے ۔ ہیڈ کلرک بھی پاگل ہے ۔ شاید پٹنہ کا رہنے والا ہے ۔ میں بھی بہت دنوں تک پٹنہ میں تھا ۔ وہیں میرے دوست سے میری ملاقات ہوئی تھی ۔ تم اس سے ضرور ملو ۔"

"چلو نا! تھوڑی ہی دور تو ہے.... بس یہ رہا اسٹیڈیم ۔ پہلے اسٹیڈیم کے گرد ٹین کی دیواریں تھیں اب تو سیمنٹ کی ہیں اور خوبصورت دکانیں بھی بن گئی ہیں، مگر ایک حصہ تو باقی ہے ۔ شاید پیسا کم پڑ گیا ہو ۔"

"شاید یہی بات ہو!"

"پچھلے دنوں اسٹیڈیم میں بہت اچھا فٹبال میچ ہوا تھا۔ آغاخاں گولڈ کپ فٹبال میچ "سوکارنو" کے دیس سے، راون کے دیس سے اور کچھ مغربی پاکستان سے ٹیمیں آئی تھیں۔ بہت بھیڑ ہوئی تھی .... اتنی کہ اس میں میری قمیض بھی پھٹ گئی تھی۔ اس کے بٹن بھی ٹوٹ گئے تھے۔ دیکھو نا! ابھی تک ٹوٹے ہوئے ہیں اور میرا پین چوری ہو گیا تھا۔ پائلٹ بہت اچھا لکھتا تھا۔ میں نے اس سے کئی خط لکھے تھے۔ ایک اپنی بیوی کو بھی۔ وہ بہت اچھی ہے، لیکن مجھے اس کی ایک ہی بات سے چڑ ہے۔ وہ مجھے پاگل کہتی ہے۔ پاگل کہیں کی۔ ارے ہاں! میں میچ کی بات کر رہا تھا۔ اس میچ کے دوران پولیس والوں نے پبلک کو خوب مارا تھا۔"

"کیوں؟"

"سب دیوار پھاند کر اندر جا رہے تھے نا! ایک سپاہی نے تو ایک آدمی کو اتنا مارا کہ وہ بیہوش ہو گیا۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ میرا دل بہت رویا تھا اور میں نے اس سپاہی کو بہت گالی دی تھی۔ قانون کے محافظ بنتے ہیں سالے! پیسا لے کر قانون کی حفاظت کرتے ہیں۔ سب سالے چور ہیں۔"

"خیر! چھوڑو ان باتوں کو...."

"دیکھو نا! اس اسٹیڈیم کے کھمبے کتنے شاندار ہیں۔ دکانیں بھی کافی بڑی بڑی ہیں۔ ہر دکان کے سامنے ایک سائن بورڈ لگا ہوا ہے اور اب تو دکانداروں نے ان کھمبوں کو بھی سائن بورڈ کے استعمال میں شامل کر لیا ہے۔ کیسے کیسے رنگین نام لکھے ہوئے ہیں، اب یہی سامنے دیکھو نا

"نیچرل ہیر ڈریسر! یہاں کچھ اس انداز سے بال کاٹے جاتے ہیں کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ بال کاٹے بھی گئے ہیں۔ بس آدھ گھنٹے تک قینچی کی کچ کچ سننے کے بعد جب آئینے میں گردن گھما گھما کر دیکھو تو معلوم ہوتا کہ پیڑوں کی طرح بڑھے ہوئے بال چھوٹے ہو گئے اور بس.... یہ رہی حجامت.... سر کی بھی اور جیب کی بھی۔"

"یہ بنگال فٹ ویر ہے.... وہ سامنے چاچا بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ خاص ڈھاکے کے رہنے والے ہیں اور یہ انہیں کی دکان ہے۔ چاچا بات کے دھنی ہیں اور کوئی گاہک اگر ان کے چنگل میں پھنس گیا تو پھر بچ کے نہیں جا سکتا۔ وہ اسے ہر طرح سے قائل کرتے ہیں۔ اپنی ایمانداری جوتے کی پائداری اور واجبی قیمت کا اس طرح یقین دلاتے ہیں کہ بس آپ قائل ہو جائیں گے۔"

"تم عید کے لئے جوتے خریدو گے؟"

نہیں.... ابھی نہیں!..... کسی اور روز۔"

"خیر! یہیں سے خریدنا، مگر اچھی طرح دیکھ لینا۔ کبھی کبھی دھوکا بھی ہو جاتا ہے۔ پچھلے سال عید پر میں نے ناگرہ خریدا تھا۔ دوسرے ہی دن اس کی سیون کھل گئی۔ میں نے جب چاچا کو بتایا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے بے تکلفانہ کہا کہ کل بھجوادو، بن جائے گا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ عید کا بازار تھا، ہیں ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں۔"

"ان کی ہنسی بڑی معنی خیز ہوتی ہے.... ان کی ایمانداری سے بھی زیادہ۔ یار! دولت کے لئے آدمی کیسے کیسے "سچ" بولتا ہے۔ چلو چاچا سے ملو گے!"

"نہیں نہیں! پہلے تم اپنے دوست سے ملاؤ۔"

"چل تو رہا ہوں۔"

"تو یہ تم نے پاگلوں کی طرح دکانوں کی تفصیل کیوں بتانی شروع کردی؟"

"دیکھو! مجھے پاگل نہ کہو۔ مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ میں تو صرف باتیں کرتا ہوں۔ کیا باتیں کرنا پاگل پن ہے۔ تب تو تم بھی باتیں کرتے ہو۔ تم بھی پاگل ہو۔"

"اچھا اچھا! تم باتیں کرو۔"

"کیا باتیں کروں؟ تم تو رنگ میں بھنگ ڈال دیتے ہو۔ خیر! اس کھمبے پر دیکھو کتنے خوبصورت حرفوں میں لکھا ہے "آبارانی"۔ تم بنگلہ جانتے ہو؟"

"ہاں! بول اور سمجھ تو لیتا ہوں۔"

"بتاؤ پھر اس کے کیا معنی ہیں؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔"

"اس کے معنی ہیں.... "پوشاک".... یہ دکان پہلے یہاں نہیں تھی بلکہ یہاں تو ایک گندہ سا پیشاب خانہ تھا جس میں گندگی کے ساتھ ساتھ اندھیرا بھی رہتا تھا۔ دن کو ایک دفعہ میں گرتے گرتے بچا تھا۔ اس دن مجھے اسٹیڈیم کمیٹی پر بڑا غصہ آیا تھا اور میں نے انہیں ایک موٹی سی گالی بھی دی تھی، پر اب دیکھو! کیسی روشنی ہے۔ رات بھی دن معلوم ہوتی ہے جیسے دولت سے سورج کی روشنی تک خرید لی گئی ہو۔ میرے گھر میں تو دن کو بھی بہت اندھیرا رہتا ہے، جبھی تو میں اس دکان کے قریب ہر روز تھوڑی دیر کے لئے رک جاتا ہوں اور روشنی کے ساتھ ہی اس کی

الماریوں میں سجی ہوئی روشن روشن سی ساڑیوں کو بھی دیکھتا ہوں۔ مجھے ان کے سنہرے اور روپہلے باڈر بڑے اچھے لگتے ہیں۔ اس بار میں یہیں سے اپنی بیوی کے لئے ساڑی خریدوں گا۔ چلو نا دیکھا جائے۔"

"تمہیں ابھی خریدنا ہے؟"

"ابھی تو نہیں، مگر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔"

"نہیں بھائی! دکاندار برا مانتے ہیں۔"

"عجیب بات ہے! دیکھنے سے برا مانتے ہیں۔"

"ان کی دکان ہے۔ کیوں نہ برا مانیں گے اور پھر دولت کی چمک تو دور ہی سے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ قریب جاؤ گے تو یہ سانپ، بچھو بن جائے گی۔ چلو مجھے جلدی ہے۔"

"تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہیں کہاں جانا ہے؟"

"میں اپنے ایک دوست سے ملنے جارہا تھا۔"

"کہاں رہتا ہے تمہارا دوست؟ تم مجھے اس سے ملاؤ نا!"

"ملاؤں گا۔ پہلے تم تو اپنے دوست سے ملاؤ۔"

"میرا دوست بہت اچھا ہے۔ تم اس سے مل کر بہت خوش ہوگے۔ اس کی مسکراہٹ میں کھو جاؤ گے۔ بس اسے مسکرانا ہی تو آتا ہے۔ زبان تو کب کی گنگ ہو چکی ہے۔"

"کیا وہ ایک دم نہیں بولتا؟"

"بولتا تھا.... میری ہی طرح۔ کبھی بہت بولتا تھا، مگر اس کی بیوی اسے پاگل نہیں کہتی تھی۔ ہاں! لڑائی جھگڑا اکثر ہوا کرتا تھا۔ وہ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کی بہت شوقین تھی اور پاس پڑوس کی عورتوں کو اچھے اچھے لباس میں دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی تھی، ان کے میاں کی تعریفیں کرتی تھی اور اپنے میاں کو کوسنے دیتی تھی۔ پھر ایک روز ایسا ہوا کہ اس کی بیوی جمن ٹھیکیدار کے لڑکے کے ساتھ فرار ہوگئی۔ محلے والوں کی زبانوں پر خوب اس کا تذکرہ رہا اور جب اس تک یہ خبر پہنچی تو جیسے اس کی زبان گنگ ہوگئی اور جب سے یہ کسی سے کچھ نہیں بولتا۔ صرف ایک ٹک دیکھتا ہے اور کبھی کبھی راکھ میں چھپی ہوئی چنگاری کی طرح مسکراتا ہے۔"

"ارے! اس دکان کے سامنے والے کھمبے پر دیکھو۔ کیا لکھا ہے۔"

"لب معشوق گلوریاں۔"

"واقعی! کیا عمدہ خیال ہے۔ بھئی! اس سے زیادہ نازک خیال اور کیا ہو سکتا ہے۔ لب معشوق اور پھر ان میں گلوریاں!"

"چلو نا! ہم لوگ بھی ایک ایک گلوری کھالیں۔"

"میں پان نہیں کھاتا۔"

"میں تو کھانے کی ہر چیز کھاتا ہوں۔"

"مگر پان تو چبانے کی چیز ہے۔"

"تو پھر چباؤں گا.... میری بیوی بھی بہت پان کھاتی ہے۔ شادی سے پہلے میری اور اس کی ملاقات یہیں ہوئی تھی۔ پہلے یہ دکان نور اللہ کی تھی۔ شاید اسی نے سب سے پہلے ڈھاکے میں ٹھنڈے میٹھے اور مسالے والے پان کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ برف کی سل پر پان سجا کر وہ بڑے ٹھاٹھ سے بیڑے بناتا۔ خوب بھیڑ ہوتی تھی۔ میں بھی یہیں روزانہ شام کو پان کھانے آجاتا اور وہ بھی آتی، مسکراہٹوں کے تبادلے ہوتے، سرخ لبوں پر زبانیں پھیری جاتیں۔ یہ سلسلہ دو ایک روز تک چلتا رہا پھر ایک روز گفتگو کی صورت نکل آئی اور .... اور پھر میری دنیا آباد ہو گئی۔ یہ سب کچھ اسی کی طرف سے ہوا تھا۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا، مگر قسم لے لو! بالکل ایسا ہی ہوا۔ یہ تو ایک حادثہ تھا جس نے میری زندگی ہی بدل دی۔ شادی کے بعد میں گھر والوں سے الگ ہو گیا۔ گھر والوں کو یہ شادی بالکل پسند نہ تھی۔ بیوی بھی الگ ہی رہنا چاہتی تھی۔ شروع شروع میں وہ مجھے بہت پسند کرتی تھی، مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ کچھ اداس اداس سی رہنے لگی۔ میں بہت پریشان ہوا۔ وجہ پوچھی۔ کچھ نہ بولی۔ جب بہت اصرار کیا تو اس نے میرے چہرے کی طرف یوں دیکھنا شروع کیا جیسے وہ خود کچھ پوچھنا، کچھ کہنا چاہتی ہو، مگر کہہ نہ پا رہی ہو، پر کچھ ہی دنوں کے بعد وہ بالکل ٹھیک ہو گئی۔ شاید پاس پڑوس کے گھروں میں آنے جانے سے اس کی طبیعت بہل گئی تھی۔

میں ان دنوں فقیراپل کے علاقہ میں رہتا تھا۔ یہ وہیں کا ذکر ہے۔ میرے پڑوس میں طرح طرح کے لوگ رہا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے، یوپی کے، بہار کے، بنگال اور پنجاب کے اور ہم لوگ آپس میں یوں تھے جیسے سب کے دکھ اپنے دکھ، اپنی خوشی سب کی خوشی معلوم ہوتی ہو۔ رشتوں کے دھاگے میں میری بیوی نے تعلقات کے موتی پرو دیئے۔ وہ اکثر و بیشتر ڈھکے چھپے لفظوں میں سبھوں کی تعریف کرتی تھی، مگر پنجابی بابو اسے کچھ زیادہ ہی اچھا لگتا تھا، کیونکہ وہ

خوبصورت تھا اور اس کی بیوی بھی خوبصورت تھی - پھر یہ کہ وہ بھی میری بیوی کے حسن کی تعریف کرتا تھا - تعریف تو عورت کی کمزوری ہے نا! اگر ایک کالی عورت کے چہرے کو چاند جیسا بتا دو تو وہ شاید تم پر جان چھڑکنے لگے -

پھر ایک سال کے بعد میرے ہاں ایک خوبصورت سی بیٹی پیدا ہوئی - یہی لاجو، جو اب کافی بڑی ہو چکی ہے اور دیکھنے میں یہ بھی پنجاب دی کڑی معلوم ہوتی ہے - "

"ارے تم پنجابی بھی جانتے ہو؟"

"ہاں! کیوں نہیں - تھوڑی بہت تو جانتا ہی ہوں - پنجابی پڑوسی کا کچھ تو اثر ہونا چاہئے - "

"تمہارا دوست کتنی دور ہو گا؟"

"بس وہ رہا سامنے - "

"وہ تو پاگل ہے - میں تو اسے روز یہیں دیکھتا ہوں - کیا یہی تمہارا دوست ہے؟"

"ہاں! یہی تو میرا دوست ہے - "

"اس کے لئے تم نے مجھے اتنی دیر سے روکے رکھا تھا؟"

"کیوں! تم ناراض ہو گئے؟ کیا پاگل دوست نہیں ہو سکتے؟ کل تم اگر پاگل ہو جاؤ تو کیا میں تمہیں اپنا دوست نہیں کہوں گا؟ ضرور کہوں گا - تم سے ملنے بھی جایا کروں گا - "

"میں پاگل کیوں ہونے لگا؟"

"تم نہ سہی، تمہاری جگہ میں سہی - نہیں.... نہیں! میں پاگل نہیں ہو سکتا - میں پاگل نہیں ہوں! میں لاجو کی ماں سے کہہ دوں گا کہ وہ مجھے پاگل نہ کہا کرے، ورنہ میں اسے چھوڑ دوں گا .... طلاق دے دوں گا - "

"ارے! تم تو جذباتی ہو گئے - اس میں غصے کی کیا بات ہے - میں نے تو یوں ہی کہا تھا - مجھے معاف کر دو! میں تمہارے دوست سے ضرور ملوں گا - وہ پاگل نہیں - "

"نہیں! وہ پاگل ہے.... بالکل پاگل ہے، مگر اس کے پاگل پن میں اس کا نہیں، اس کے حالات کا اور اس کی بیوی کا قصور ہے جو اسے چھوڑ کر ایک ٹھیکیدار کے لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی اسے اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی - وہ محبت کرتی تھی، مگر اسے دولت کا نشہ تھا - بس اسی نشے میں آ کر تو اس نے اسے چھوڑ دیا اور وہ یہ سوچتے سوچتے، گاؤں والوں کے طعنے سنتے سنتے ایک دن پاگل ہو گیا - میں اسے بہت سمجھاتا، لیکن وہ صرف ایک ہی بات کہتا کہ کاش اس کے پاس بھی دولت

ہوتی اور میں کہتا دولت ہو کر بھی کیا کرتی - تیری بیوی ہی ٹھیک نہیں تھی - وہ کہتا نہیں اس کی بیوی ٹھیک تھی - اسے بہکایا گیا ہے - وہ اپنی بیوی کے خلاف کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ تھا - بے پناہ محبت کرتا تھا نا! محبت اندھی ہوتی ہے - دیکھو! یہ مجھے پہچاننے کے باوجود بھی مجھ سے کچھ نہیں بولتا - کبھی اتنا سنجیدہ ہو جاتا ہے کہ جیسے رو پڑے گا، مگر پھر فوراً ہی مسکرانے لگتا ہے - عورتوں کی طرف تو دیکھتا تک نہیں بڑا دکھی ہے بے چارہ -"

"تم اتنے خاموش کیوں ہو؟ تمہارے لئے تو یہ پاگل ہے، مگر میں تو اسے پاگل نہیں کہتا -

"تو پھر اسے کیا کہو گے؟"

"سادھو!"

"اچھا!"

"دیکھو نا! اس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹ ہے، چہرے پر داڑھی ہے جو مونچھوں سے مل کر ایک ہو گئی ہے - سادھو تو ایسا ہی ہوتا ہے نا!"

"ہاں! ایسا ہی ہوتا ہے -"

"تم ہنس کیوں رہے ہو؟"

"تمہاری باتیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں -"

"ارے! وہ نورو، میرا پڑوسی، دوڑتا ہوا میری طرف کیوں آ رہا ہے؟ کیا بات ہے نورو! کیا تمہاری بیوی نے تمہیں گھر سے نکال دیا؟"

"ارے نہیں! تمہاری بیوی رجب علی کے ساتھ بھاگ گئی -"

بھاگ گئی.... رجب علی کے ساتھ.... جھوٹ بالکل جھوٹ! میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں - وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے - تمہاری بیوی بھاگ گئی ہوگی - میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا - تم جھوٹے ہو - میری بیوی پر تہمت لگاتے ہو.... تم جھوٹے ہو.... دور ہو جاؤ.... ورنہ.... ورنہ -"

"ہائیں ہائیں! یہ کیا کر رہے ہو؟ چھوڑو! نورو کی گردن چھوڑو -"

"دیکھو نا احمد بھیا! یہ کہتا ہے میری بیوی بھاگ گئی -"

"میں سچ کہتا ہوں -"

"تو جھوٹ بولتا ہے -"

"قسم خدا کی تیری بیوی بھاگ گئی۔"

بھاگ گئی.... بھاگ گئی!.... ہاہاہا!.... بھاگ گئی، مگر وہ میری بیٹی لاجو؟ وہ تو ہے نا! میں اسی کے سہارے زندگی گزار لوں گا۔"

"وہ تو اسی رات سے غائب ہے جس رات تم گھر نہیں گئے تھے۔"

"مگر یہ تو کہہ رہے تھے کہ عید کے لئے کپڑے خریدنے نکلے ہیں۔"

"نہیں نہیں! یہ ایسے ہی کہتے ہیں۔ یہ دو دنوں سے گھر نہیں گئے ہیں۔"

"نورو! تم انہیں گھر لے جاؤ۔"

نہیں! میں گھر نہیں جاؤں گا۔ میرا گھر کہاں.... میری بیوی کہاں، میری بیٹی کہاں، لاجو کہاں؟.... سب کہاں چلے گئے؟ سب بھاگ گئے۔ سب بھاگ گئے.... ہاہاہا.... ہاہا.... ہاہا.... ہاہاہا!"

اور وہ یوں قہقہے لگا رہا تھا جیسے ایک لمحے کے لئے رکا تو اس کا دم نکل جائے گا۔

(عزم نو۔ پاربتی پور۔ ۱۹۶۸ء)

پالا

اور شاموں کی بہ نسبت آج شام بڑی سرد تھی۔ ہوا میں برف کی سی ٹھنڈ رچی ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں جاڑے کی شدت سے بے جان ہو رہے تھے اور پے بہ پے لگتے ہوئے سرد ہواؤں کے جھونکے سردی کے احساس کو اور بھی شدید کر رہے تھے۔ رحیموں میلی سی چادر اوڑھے ہاتھوں کو چادر میں لپیٹے، کانوں کو میلے لال گلوبند سے ڈھانکے تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا، خوش خوش گھر لوٹ رہا تھا۔ اس کی قمیض کی اوپری جیب میں ایک ماہ کی کمائی اس کی مچلتی ہوئی آرزوؤں کو گرمی پہنچا رہی تھی۔ اس کا چادر میں چھپا ہوا داہنا ہاتھ جیب میں رکھے ہوئے روپیوں پر تھا۔ اور اسکے گرد آلود پاؤں سردی کی شدت کے باوجود بھی بڑی سرعت سے اٹھ رہے تھے۔ ایک ہی خیال بار بار اس کے تھکے ہوئے ذہن سے ٹکراتا،

"کل وہ لحاف ضرور بنوالے گا تب اس کا منا سردی نہ کھا سکے گا اور اپنی ماں کی گود میں بیخبری کی نیند سو سکے گا۔ پھر اسے ان شدید سردیوں کا کچھ بھی خوف نہ رہے گا۔"

وہ چلتے چلتے جیسے لحاف کی گرمی محسوس کرنے لگتا۔ اس کا دل خوشی سے اچھل پڑتا۔ اس کے قدم اور بھی تیز اٹھنے لگتے اور اس کے احساسات خوشی کی گرمی پاکر ذہن کے گوشوں سے جھانک کر سردی کا منہ چڑانے لگتے۔ آج وہ اپنی حباب کی طرح سر اٹھاتی ہوئی آرزوؤں کو اٹوٹ سمجھ رہا تھا۔ اب سردی اس کے منے کو نہ ستا سکے گی۔ اس نے اس بے بس تنکے کی طرح سوچا جسے کنارا مل گیا ہو اور اس نے جیب میں رکھے ہوئے روپیوں پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے پھر سوچا....

"گذشتہ سال بھی ایسی ہی سردیاں تھیں۔ اس نے لحاف بنوانے کی کتنی کوشش کی تھی۔ لیکن لحاف نہ بن سکا تھا۔ ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ پڑ جاتی۔ کبھی وہ خود بیمار پڑ جاتا تو کبھی ننھے کو سردی سے دست آنے لگتے۔ پھر کئی ماہ مستقل غیر حاضر ہونے کی وجہ سے اسے ملازمت سے

برطرف بھی کر دیا گیا تھا اور ملازمت ڈھونڈنے میں اسے کتنے ہی پاپڑ بیلنے پڑے تھے، مگر ان وقتی پریشانیوں میں الجھا رہنے کے باوجود بھی اس کی سگھڑ بیوی دوا دارو اور نون تیل سے پیسے بچا کر پس انداز کرتی۔ اس طرح اس بار وہ صرف روئی خرید سکا تھا اور دو ہی چار دن کے اندر لحاف بھروانا چاہتا تھا کہ اچانک ایک رات ایسی ہی ٹھنڈک ننھے کو ٹھنڈا کر گئی۔" اس طرح اس کی ساری آرزوئیں برفیلی ہواؤں میں دب کر مر گئیں۔ ننھے کی بے وقت موت نے ان کی زندگی کو ویران کر دیا۔ رحیموں کی بیوی کا روتے روتے برا حال تھا۔ پہلے بچے کی ناگہانی موت سے ان کے دل پر ایک شدید چوٹ لگی تھی۔ رحیموں ہر وقت سمجھاتا رہتا، طرح طرح کی باتیں کر کے اس کا جی بہلاتا، اس کی دلجوئی کے لئے لاکھ جتن کرتا اور اس کی ہر خواہش کو پورا کرتا رہتا۔ اس طرح وہ بیوی سے زیادہ سے زیادہ قریب رہنے کی کوشش کرتا تا کہ وہ قریب رہ کر اس کے غم کو ہلکا کر سکے۔ خود رحیموں، بیوی کے قریب رہ کر اپنا غم غلط کرتا۔ طرح طرح کی چھیڑ چھاڑ سے وہ بیوی کو خوش رکھتا رات کی خوشگوار حسین چاندنی میں وہ بڑی دیر تک اچھی اچھی باتیں کرتا رہتا۔ وہ بیوی سے اتنا قریب ہو گیا تھا جہاں جسم اور روح کی دوری کا احساس تک باقی نہیں رہتا۔ جیسے دور افق کی اور زمین و آسمان آپس میں گلے ملتے ہوئے معلوم ہوں۔ رحیموں کی محبت پدما جل کی طرح نرمل اور کنول کی طرح کومل تھی۔

ایک روز جب رحیموں کسی بات پر بہت خوش تھا تو اس کی بیوی نے اسے شرماتے لجاتے ہوئے بتایا کہ وہ پھر بار آور ہو گئی ہے۔ یہ سن کر رحیموں کی آنکھیں مسکرانے لگیں اور اس کی بیوی کے چہرے پر ایک حیا بار شوخی رقص کرنے لگی۔ وہ پھر ایک نیا خواب دیکھنے لگا۔ انہیں بچے کی کتنی آرزو تھی، وہ بچے کے لئے کتنے بے چین تھے غرض جیسے جیسے دن گزرتا گیا، ویسے ویسے ننھے کا غم بھی کم ہوتا گیا۔ ننھے کی ماں کو رفتہ رفتہ صبر آتا گیا اور ساتھ ہی ساتھ دکھ بھری سرد راتیں بھی کٹتی گئیں۔ سردی کا زور بھی کم ہوتا گیا۔

پھر ہولے ہولے وقت کی منہ زور لہریں سردی کو اپنے ساتھ بہالے گئیں اور گرمی کا موسم آپہنچا۔ دن بھر زندگی کی ضرورتوں میں الجھا رہنے کے بعد رات کی حسین چاندنی میں دن کی ساری کلفتیں ڈھل جاتیں اور زندگی چاندنی کے سائے میں بڑی حسین لگنے لگتی۔ چاندنی رات میں بہتی ہوئی خنک ہوائیں احساس کو بیدار کرتیں۔ ان ہواؤں میں سردی کی برفیلی آمیزش کے بجائے چاندنی کی ٹھنڈک ہوتی اور اس فرحت بخش ٹھنڈک سے دن بھر کے تھکے سے اعصاب نئی

زندگی پاتے ۔ رحیموں اپنے بانس کے بنے ہوئے جھونپڑے کے باہر پھیلی ہوئی دودھیا چاندنی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا اور اسے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آجاتا جب وہ گاؤں کے بچوں کے ساتھ اندھیرے اجالے کا دلچسپ کھیل کھیلا کرتا ۔ اسے آپ ہی آپ مسکراتے ہوئے دیکھ کر اس کی بیوی بھی قریب آجاتی اور اس سے مسکرانے کا سبب پوچھتی جس پر وہ بیوی کا ہاتھ پکڑ کر چاندنی کے خوشگوار سائے میں جھونپڑے سے باہر نکل جاتا اور پھر بڑی دیر تک مدھم مدھم قہقہے فضا کا سکون بکھیرتے، چاندنی کو گدگداتے رہتے ۔

اور اس طرح زندگی بڑے سکون سے ایک مخصوص ڈگر پر چل پڑی تھی ۔ رحیموں اپنی ساری تکلیف بھول چکا تھا ۔ اسے ایک جگہ ملازمت بھی مل گئی تھی جہاں وہ روزانہ کام کیا کرتا تھا ۔ اگرچہ یہ ملازمت بھی مستقل نہ تھی، پھر بھی وہ اپنی روزانہ کی محنت مزدوری میں ہی خوش تھا ۔ اب اسے بڑی آرزو تھی کہ منا جلد پیدا ہو جو اپنی معصوم مسکراہٹوں میں ماں باپ کے غم کو سمیٹ لے، جو ان کے لئے خوشیوں کے چراغ روشن کردے اور جو ان کی آرزوؤں اور منتوں کا مرکز ہو .... اور پھر ایک دن وہ وقت بھی آپہنچا جب اللہ نے اسے ایک پیارا سا بچہ عطا کر دیا ۔ زندگی پھر ایک بار مسکرا اٹھی ۔ آرزوئیں پھر ایک دفعہ دل کے نہاں خانے میں کروٹیں بدلنے لگیں ۔ رحیموں خوشی کے احساس سے پھولا نہ سماتا تھا ۔ اللہ نے ننھے کی جگہ پر کرنے کے لئے منا بھیج دیا تھا اور پھر منے کی مسکراہٹوں نے ننھے کے غم کو آہستہ آہستہ اپنے اندر سمیٹ لیا ۔ منا رحیموں کے سارے زخموں کے لئے مرہم بن گیا تھا ۔

وقت گزرنے کے ساتھ ہی رحیموں کی زندگی میں بھی تبدیلیاں آتی گئیں ۔ پہلے وہ روزانہ کام کیا کرتا تھا اور ہر روز کی مزدوری سے اس کی دو وقت کی روٹی کا ٹھکانا ہوتا تھا، مگر کچھ ہی روز قبل اسے ایک مستقل ملازمت ایک عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں مل گئی تھی ۔ اس عمارت کو بہت کم عرصے میں زیادہ پیسے خرچ کر کے تیار ہونا تھا، لہذا وہ بڑی مستعدی سے کام پر جانے لگا ۔ منے کی پیدائش اس کے لئے اتنی شبھ ثابت ہوئی جیسے اس نے گولر کا پھول دیکھ لیا ہو ۔ وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا ۔ منا اسے بے حد عزیز تھا ۔

تقریباً ایک سال کا عرصہ نہ جانے کیسے گذر گیا ۔ اسے کچھ بھی احساس نہ ہوا، مگر جب سرمئی شامیں سرد ہونے لگیں تو اسے احساس ہوا کہ جاڑا پھر شروع ہو رہا ہے اور اس احساس کے ساتھ ہی رحیموں کو یہ خیال بھی بری طرح ستانے لگا کہ منے کے لئے لحاف کی سخت ضرورت ہے ۔ بغیر روئی

کی گرمی کے سردی نہیں جاتی، اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ ننھے کی طرح یہ بھی، ہم سے چھن جائے۔
اس خیال کے آتے ہی وہ تھوڑی دیر کے لئے ماضی کی طرف مڑ کر دیکھنے لگتا جہاں اسے جاڑے کی
شدت اور ننھے کی موت کا سماں دکھائی دیتا۔ اس کی روح لرز اٹھتی اور اس کا ذہن پریشان ہو جاتا
پھر وہ اس منحوس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیتا، اس لئے کہ منے کے متعلق ایسا سوچنا وہ گناہ
سمجھتا تھا۔ وہ کئی مہینوں سے سوچ رہا تھا کہ اس ماہ لحاف ضرور بنوالے گا، لیکن ایک نہ ایک
پریشانی مہینہ ختم ہوتے ہی یا تنخواہ ملتے ہی آموجود ہوتی جیسے پریشانیاں بھی روپیوں کے انتظار میں
رہتیں۔ کئی بار تو منے کی ماں بیمار پڑی اور اس کے علاج میں روپے خرچ ہوئے۔ خود ایک دفعہ
منے کو دانت نکلنے کے سلسلے میں، بخار آیا اور کئی دست بھی آئے۔ پھر ایک مرتبہ رحیموں کے ہاتھ پر
پوری اینٹ گر پڑی جس سے اس کی انگلیاں شدید زخمی ہوئیں اور وہ کئی ہفتے کام پر نہ جاسکا اور ان
دنوں کے پیسے کٹ گئے۔ ان چھوٹی چھوٹی پریشانیوں کے علاوہ منشی جی بھی اس کے لئے ایک
مستقل پریشانی کا سبب تھے۔ ہر مہینے یا ہر ہفتے جب بھی تنخواہ ملتی، مزدور منشی جی کی ایک بندھی
ہوئی رقم اس طرح الگ کر دیتے جیسے ان کی مزدوری میں منشی جی بھی حصے دار ہوں۔ اور اگر کبھی
کوئی مزدور اپنی مجبوریوں کے سبب منشی جی کا حصہ الگ نہ کرتا تو منشی جی اپنے پتلی کمانی کے چشمے کو
آدھی ناک پر کھسکا کر لاتے اور پہلے چشمے کے شیشے کے اوپر سے آنکھیں چڑھا کر اس شخص کو اس
طرح دیکھتے جیسے ان کی آنکھیں کہہ رہی ہوں،

"یہ تم اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے ہو۔ جانتے ہو اس کا کیا انجام ہوگا؟" غرض اس طرح
منشی جی جونک کی مانند لپٹے ہوئے مزدوروں کا خون چوستے رہے اور اکثر و بیشتر رحیموں منشی جی کی
زد میں آتا رہا۔ اس طرح نت نئی پریشانیاں، بھانت بھانت کا روپ دھارتی رہیں اور وہ انہیں
پریشانیاں کے بیچ گھرا ہوا حالات کا مقابلہ کرتا رہا تھا۔ وہ اتنی مجبوریوں اور پریشانیوں کے باوجود
بھی زیادہ سے زیادہ محنت کرتا۔ کئی کئی روز تک کام کے سلسلے میں گھر واپس نہ جاتا اور رات کو
بھی پلاسٹر کا کام مزدوروں کے ساتھ کرتا رہتا۔ اس طرح اسے کچھ زیادہ پیسے مل جاتے، لیکن اتنی
محنت کے باوجود بھی حالات تھے کہ سلجھتے ہی نہ تھے، آرزوئیں تھیں کہ تکمیل کو پہنچتی ہی نہ تھیں
جیسے سب اس کے حریف ہوں، اور اسے زندگی سے مقابلہ کرنے پر مجبور کر رہے ہوں۔

جیسے جیسے مہینہ گزرتا گیا، سردیاں شدید ہوتی گئیں اور پھر دسمبر کا مہینہ آگیا۔ ہوا میں
برفیلی خنکی رچ گئی۔ سرِشام ہی ہاتھ پاؤں ٹھٹھرنے لگے۔ اکثر دن دن بھر سورج کی کرنیں نہ دکھائی

دیتیں اور آسمان پر سیاہ بادل پھیلے رہتے۔ ادھر دو تین روز سے سخت پالا پڑ رہا تھا۔ کھیتوں میں فصل کو لاہی لگ رہی تھی۔ لحاف کمبل چھوڑ کر گھر سے باہر نکلنے کی ہمت نہ ہوتی۔ رحیموں کئی دن سے کام پر گیا ہوا تھا۔ گھر پر اس کی بیوی اور منا تنہا تھے۔ مہینہ ختم ہونے کو چند ہی روز باقی تھے، لہٰذا اس نے سوچا تھا کہ تنخواہ لے کر گھر جائے گا، لیکن اس قدر بڑھی ہوئی سردی دیکھ کر اس نے مالک سے تنخواہ پیشگی مانگی۔ مالک نے پہلے تو انکار کیا، لیکن جب اس نے اپنی مجبوریاں بتائیں اور منے کو سردی لگ جانے کا اندیشہ ظاہر کیا تو مالک نے بڑی حیل و حجت کے بعد تنخواہ دے دی۔

تنخواہ لے کر رحیموں خوش خوش اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ وہ گذشتہ کئی روز سے گھر نہیں گیا تھا، اس لئے کہ عمارت کی تعمیر کا کام بڑی تیزی سے ہو رہا تھا اور ٹھیکیدار زیادہ پیسے دے کر مزدوروں سے دن رات کام لے رہا تھا۔ رحیموں کو پیسے کی سخت ضرورت تھی، لہٰذا اس نے بیوی کو بھی بتا دیا تھا کہ وہ کچھ روز تک گھر نہیں آئے گا اور وہیں رہ کر زیادہ پیسے کمائے گا تاکہ ان پیسوں سے منے کے لئے جلد سے جلد لحاف بنوا سکے۔ سب سے زیادہ خیال اسے منے کا تھا۔ منے کو اس نے کئی روز سے دیکھا نہیں تھا اس لئے اور بھی اس کی طبیعت پریشان تھی لیکن اس کے قدم خوشی کے مارے تیز تیز اٹھ رہے تھے اور اس کے ذہن میں وہی ایک خیال بار بار آ رہا تھا کہ کل وہ لحاف ضرور بنوالے گا اور پھر منا سردی سے بچ رہے گا، مگر گذشتہ کل سے آج زیادہ سردی تھی۔ ہوا بھی کافی تیز چل رہی تھی اور کئی روز سے سخت پالا پڑ رہا تھا۔ لیکن اسے سردی کا کچھ بھی احساس نہ تھا جیسے اپنے فرض کے سامنے وہ سب کچھ بھول گیا ہو۔ وہ بڑی تیزی سے لپکا اپنے گھر جا رہا تھا۔ گاؤں کی بے ترتیب گلیوں سے گذرتا ہوا وہ اپنی گلی کے موڑ پر مڑ گیا۔ اس کا گھر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور اس کے قدم اور بھی تیز اٹھ رہے تھے۔ وہ جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ بہت خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ اسے دیکھ کر بیوی کتنا خوش ہوگی اور وہ منے کو گود میں لے کر کتنا پیار کرے گا۔ منا مسکرا مسکرا کر اس کی گود میں کھیلے گا اور وہ منے کی مسکراہٹ میں اپنا سارا غم بھول جائے گا۔ وہ یہی سوچتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اس نے گھر میں محلے کی کچھ عورتوں کو دیکھا جو بالکل خاموش تھیں، لیکن جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے بیوی کو چوکی پکڑے زمین پر سر جھکائے بیٹھے دیکھا۔ منے کو چادر اوڑھا دی گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ آخر اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا،

"کیا بات ہے؟" جواب میں تمام عورتوں نے سر جھکا لیا۔ اس کی بیوی نے سر اٹھا کر ویران آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنا سر چوکی کے کنارے دے مارا۔

(شاخِ گل۔ پٹنہ۔ ۱۹۶۲ء)

آرزوؤں کا ایک ویرانہ

"چاچا.... چاچا! آرجو کو پولیس لے گئی۔"

شیرو نے ہانپتے ہوئے بڑی مشکل سے یہ خبر سنائی اور علی میاں کے قریب کھڑے ہو کر اپنے میلے دامن سے چہرے کا پسینہ پونچھنے لگا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو شیرو؟" علی میاں کے پیروں تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں چاچا!"

مگر کیوں؟ کیا کیا تھا آرجو نے؟

"اس نے بس میں ایک بڑے بابو کی جیب پر ہاتھ ڈالا تھا۔"

"بابو کی جیب پر ہاتھ ڈالا تھا!" علی میاں زیر لب بڑبڑایا۔ پھر ایک دم جذباتی ہو گیا۔

"نہیں.... نہیں! یہ جھوٹ ہے۔ آرجو کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں چاچا! اسے...."

"علی میاں اور جذباتی ہو کر شیرو کے شانے جھنجھوڑنے لگا۔

"نہیں! تو جھوٹ بولتا ہے۔ آرجو کبھی پاکٹ مار نہیں ہو سکتا۔ وہ سریپھ (شریف) ہے۔ وہ میرا بیٹا ہے.... میرا.... سمجھا!" علی میاں نے جملے کے آخری الفاظ پر زور دیتے ہوئے کچھ اس اعتماد سے کہا جیسے اسے آرجو کا باپ ہونے پر فخر ہو۔

"یہی تو سب کہہ رہے تھے چاچا! مگر بڑے بابو نے تو اپنی جیب پر اس کا ہاتھ پکڑا تھا.... اور.... اور کئی تھپڑ مارنے کے بعد اسے پولیس کو دے دیا۔" شیرو اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور اس کی آنکھیں علی میاں کے چہرے سے ہٹ کر زمین پر جم گئیں اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس خبر نے اسے مجرم اور گناہگار سا بنا دیا ہو۔

علی میاں کے پاس اب بظاہر کوئی سوال نہ تھا، البتہ اس کے دل میں ایک طوفان اٹھ رہا تھا .... ایک ایسا طوفان جس نے اس کے پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو اور آج پہلی مرتبہ زمین کی چھاتی پر اسے اپنا وجود بوجھ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں کرب کی سوئیاں چبھ رہی تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم سے شرافت کا لبادہ نوچ پھینکا ہو .... اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"نہ رو چاچا! میں آرجو کو چھڑانے کے لئے اپنی جان تک دے دوں گا۔ وہ میرا بھی تو دوست ہے نا!"

اور علی میاں کو یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں کے گرد پھیلا ہوا اندھیرا اچانک اجالے میں تبدیل ہو گیا ہو۔ اس نے شیرو کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"مجھی کو اپنا بیٹا سمجھ لے چاچا! میں بھی تو تیرا ہی بیٹا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے شیرو کا گلا رندھ گیا اور اس کے دل کا غبار آنسو بن کر آنکھوں میں اتر آیا۔ شیرو کے محبت بھرے الفاظ سن کر علی میاں کو یوں محسوس ہوا جیسے آرجو مل گیا ہو۔

شیرو اگرچہ آرجو کا گہرا دوست تھا، مگر علی میاں کا دل اس کی طرف سے صاف نہ تھا۔ وہ اسے دوسرے تمام "فٹ پاتھئے" لڑکوں کی طرح لفنگا سمجھتا اور آرجو کو ان لڑکوں کی صحبت سے دور رہنے کی تاکید کرتا، مگر آرجو تنہا ہونے کے ساتھ ساتھ نو عمر بھی تھا، شاید اسی لئے تنہائی سے زیادہ اس کا بچپن اسے ان لڑکوں کی طرف کھینچ لاتا اور وہ ہر روز ان کی صحبت میں کھیلتا۔ لے دے کے یہی گندہ ماحول ہی تو اس کا سب کچھ تھا۔ یہیں اس نے آنکھ کھولی، پلا، بڑھا.... پھر وہ اس ماحول سے اپنے آپ کو کیسے دور رکھ سکتا تھا۔ اس نے بڑے دکھ سے سوچا کہ کہیں گندی نالیوں سے کیڑے دور رہ سکتے ہیں۔ اسے بھی اگر اس ماحول سے دور رکھا جاتا تو شاید وہ بھی مر جاتا۔ اسی ماحول نے تو اسے ماں کے مرنے کا غم، باپ کی بیکسی اور اپنی بے بسی کو محسوس نہ ہونے دیا تھا، مگر اس کے باوجود اس کا باپ اسے ان آوارہ لڑکوں سے، ہمیشہ دور رکھنا چاہتا۔

علی میاں زمانے کے مصائب سے مقابلہ کرتے کرتے تھک کر بوڑھا ہو گیا تھا، مگر اس کی رگوں میں شرافت کے خون کی حرارت اب بھی باقی تھی۔ غربت اور مفلسی نے اسے بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا تھا، لیکن شرافت کا دامن اس حال میں بھی اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا تھا۔ وہ تمام دن راستے کے کنارے ٹن کا ڈبا رکھے بیٹھا رہتا، مگر منہ سے کچھ نہ کہتا۔ نہ زمانے کا شکوہ، نہ قسمت

کا گلہ حتیٰ کہ کبھی کسی نے اسے ہاتھ پھیلاتے بھی نہیں دیکھا۔ وہ اس ماحول میں سب سے الگ تھلگ نظر آتا جیسے زنجیر سے ایک کڑی الگ ہو گئی ہو۔ اسی خصوصیت نے اسے راہگیروں کی توجہ کا مرکز بنا دیا تھا، چنانچہ ہر گزرنے والا ایک لمحے کے لئے رک کر اس "خاموش ضرور تمند" کو ضرور دیکھتا اور پھر یوں گذر جاتا جیسے اس کے دکھ کا بوجھ اپنے دل پر لئے جا رہا ہو۔ آرجو کو وہ ہمیشہ بروں کی صحبت سے دور رہنے کی تاکید کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ بُرے کبھی اچھے نہیں ہو سکتے، شاید یہی وجہ تھی کہ شیرو کا کردار علی میاں کے دل میں، ہمیشہ کانٹے کی طرح چبھتا رہتا، مگر وہ اس کا اظہار نہ کر پاتا، کیونکہ وہ آرجو کا گہرا دوست تھا۔ ویسے وہ آرجو کو کلو اور خیرو کی طرح شیرو سے بھی دور رہنے اور کم ملنے جلنے کے لئے کہتا، مگر وہ کسی نہ کسی بہانے رو کر یا روٹھ کر باپ کو منالیتا اور کم سے کم ہر روز شیرو سے ضرور ملتا۔ شیرو اس کا سب سے گہرا دوست تھا۔ آج اسی شیرو کے منہ سے محبت بھرے الفاظ سن کر علی میاں کو اپنی شدید غلطی کا احساس ہوا تھا۔ آج سے پہلے اس نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ فٹ پاتھ پر رہنے والوں کے دل میں بھی دردمندی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ نرے لفنگے، چور، بدمعاش اور جیب کترے ہی نہیں بلکہ انسان بھی ہوتے ہیں اور دوسروں کے دکھ میں ان کی آنکھیں بھی روتی ہیں۔ وہ یہی سوچتا ہوا آہستہ آہستہ اپنی جھگی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ ہر چیز اداسی کے احساس میں ڈوبی ہوئی لگ رہی تھی۔ رمنا ریسٹ ہاؤس کے سامنے کی جھاڑیوں میں جھینگروں کی آواز لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اکا دکا سریش کے درختوں پر کوؤں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ جناح ایونیو میں ایسٹرن مرکنٹائل بینک کی عمارت کے پشت والے راستے پر، جہاں دیوار سے لگی علی میاں کی جھگی ہے، راہگیروں کا ہجوم بڑھنے لگا۔ پٹنہ چاٹ، ملا چاٹ اور خان کے پاپڑ کے گرد بھیڑ لگنے لگی۔ پٹنہ چاٹ والے ماما مسکرا کر پانی پوڑی، دہی بڑے اور چٹپٹی کی رکابیاں بے صبرے گاہکوں کی طرف بڑھا رہے تھے اور بنیوں خوجوں اور میمنوں کی فیملی کاروں کے علاوہ سیٹھوں اور بینک کے منیجروں کی کاریں آنے لگیں۔ رمنا ریسٹ ہاؤس روشن ہو گیا تھا۔ گلستان ریسٹورنٹ کے باورچی خانے سے طرح طرح کے کھانوں میں ملی ہوئی سیخ کباب کی سوندھی سوندھی خوشبو راہگیروں کے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ فضا میں کچھ عجیب گھٹا گھٹا سا شور تھا۔ کبھی کبھی چٹپٹی کھانے والوں کے بیچ سے قہقہے ابھر کر ماحول کی یکسانیت کو درہم برہم کر دیتے تھے۔ ہر روز کی طرح آج بھی زندگی کی ہماہمی اور چہل پہل میں کوئی فرق نہ تھا، مگر اس ہنستے اور مسکراتے ہوئے ماحول میں آرجو نہ تھا اور علی میاں بالکل تنہا رہ گیا

تھا۔ اس کی اینٹوں، چیتھڑوں اور بانس کی کھپچیوں سے بنی ہوئی جھگی میں مکمل سناٹا تھا۔ آج وہ دیا بھی روشن نہ ہوا تھا جو ہر روز اس جھگی کو روشنی بخشتا۔ آج تو یہ جھگی بیکسی کا مزار معلوم ہو رہی تھی اور اس میں علی میاں کے آنسوؤں کے بیشمار چراغ جل رہے تھے۔ وہ جھگی میں بیٹھا آرجو کی لائی ہوئی ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جدھر جدھر دیکھتا، اسے آرجو کا ہنستا، مسکراتا، روتا، بلکتا ہوا چہرہ نظر آتا۔ آج تو اسے جھگی کی ہر چیز آرجو کا چہرہ معلوم ہو رہی تھی اور اس کے ذہن میں اسی چہرے کے مختلف نقوش ابھر رہے تھے۔

آج سے کئی برس پہلے وہ سیلاب کی زد سے بچ کر شہر آگیا تھا۔ گاؤں بالکل تباہ ہو چکے تھے، فصلیں برباد ہو گئی تھیں اور کھیت دریا بن گئے تھے۔ حدِ نگاہ تک پانی ہی پانی تھا۔ مویشی، جھونپڑیاں اور کسان پدما اور میگھنا کی لہروں پر بہے جا رہے تھے۔ ہر طرف ایک عجیب ڈراؤنی چیخ سنائی دیتی۔ کسی کو اپنے پرائے کا ہوش نہ تھا۔ لوگ جیسے تیسے جانیں بچا کر بھاگ رہے تھے۔ ایسے عالم میں وہ بھی آرجو کو اپنی گود میں لئے بھاگ رہا تھا۔ جس پدما کے کنارے اس نے زندگی کے حسین تر لمحات گزارے تھے، آج اسی کی لہریں اس کی بیوی کو بہا کر لے گئی تھیں اور بڑی مشکلوں سے وہ ڈھاکا پہنچ سکا تھا۔ یہاں اس کا کوئی نہ تھا۔ کئی روز تک وہ شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا۔ بھوک اور پیاس سے اس کا برا حال تھا۔ آرجو اس کی گود میں بھوک سے تڑپ تڑپ کر ادھ موا ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی بچے کی حالت دیکھ کر وہ بے اختیار رو پڑتا۔ جس دکان اور ہوٹل کے سامنے وہ کھڑا ہوتا، لوگ اسے روٹی اور پیسے کے عوض "معاف کرو!" کے خشک الفاظ سنا دیتے اور وہ مایوس ہو کر آگے بڑھ جاتا۔ اگر کبھی کسی کو اس کے حال پر ترس آجاتا تو وہ دو ایک پیسے تھما دیتا۔ اس کے ساتھ ہی ایک لمحے کے لئے اس کے آنسو تھم جاتے اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ سوچتا شاید اچھے دن دور نہیں۔ پھر اسی امید کے سہارے آگے بڑھ جاتا۔ اسی طرح مر جی کر اس نے کئی دن گزارے اور پھر بھٹکتا ہوا رمنا ریسٹ ہاؤس کے قریب آگیا۔ یہاں گلستان ریسٹورنٹ کے باورچیوں نے جب اس کی درد بھری کہانی سنی تو انہیں اس کے حال پر رحم آگیا۔ انہوں نے اسے پیٹ بھر کھانے کو دیا اور آرجو کے ننھے ہاتھوں میں دودھ کی کٹوری تھما دی۔ شہر میں یہ پہلی بھرپور، ہمدردی تھی جس نے اس کے دل میں جینے کی لگن کو تیز کر دیا۔ اس رات وہیں عمارت کے چبوترے پر وہ دونوں جی بھر کے سوئے۔ شاید یہ ان کے سکون کی پہلی رات تھی۔

دوسری صبح جب آنکھ کھلی تو اسے اپنے جسم میں کچھ طاقت محسوس ہوئی۔ آرجو کے چہرے

پر بھی رونق آگئی تھی۔ پھر وہ اسی جگہ رہنے لگا۔ ہوٹل کا بچا کھچا کھانا ہر روز مل جاتا اور اس کے ساتھ ہی، ہمدردی کے چند میٹھے بول بھی، جو شہری زندگی میں عنقا ہوتے ہیں، اس کے حصے میں آ جاتے۔ یہی نہیں بلکہ آرجو کے لئے ہوٹل کے بیروں اور باورچیوں نے اپنی گدڑیاں بھی دے دی تھیں جن کو گھیر گھار کر اس نے سر چھپانے کی جگہ بنالی تھی۔ اب وہ اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس نہیں کر رہا تھا اور پھر اس طرح اس نے نئے سرے سے زندگی کی جدو جہد کا آغاز کیا۔

یوں تو گاؤں میں بھی اس پر بارہا برے وقت آئے، مگر اس نے پیٹ کی خاطر ہاتھ کو سہارا کبھی نہیں بنایا، شاید اس لئے کہ گاؤں والے تو اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہی بھوک کا اندازہ لگالیتے اور اسے بغیر کچھ کہے سب کچھ مل جاتا، مگر شہر میں کئی روز بھوکا رہنے کے بعد بھی کسی نے اس کے اترئے ہوئے چہرے کو نہیں پہچانا۔ شاید یہاں والوں کی آنکھیں بھی دل کی طرح بدل جاتی ہیں اسے اس بات کا پورا احساس تھا، چنانچہ اس نے سوچا کہ " وہ باورچیوں کے سہارے کب تک رہے گا۔ اسے خود کچھ کرنا چاہئے "مگر وہ کرتا بھی کیا۔ صدموں کی یورش نے تو تھوڑے ہی عرصے میں اسے اس قدر لاغر کر دیا تھا کہ اب اس میں محنت مزدوری کرنے کی سکت نہ تھی اور سب سے بڑا سوال تو شیر خوار آرجو کا تھا جو پانچ بچوں پر تنہا بچ گیا تھا اور اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ بھلا اسے کس کے حوالے کرتا، کس پر چھوڑ کر محنت مزدوری کرنے جاتا!

اپنی جھگی کے سامنے بیٹھا وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اس طرف سے گذرتے ہوئے ایک راہگیر نے ایک آنا اس کے سامنے پھینک دیا۔ اچانک پہلی بار اس کی نظر اس راہگیر کی طرف اٹھ گئی اور اس نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا۔ پھر اس کا دل ایک بار زور سے دھڑکا جیسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو، لیکن فوراً ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ پھر اس نے زمین پر پڑے ہوئے پیسے کو دیکھا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے آئندہ سفر کے لئے راستہ ہموار ہو گیا ہو اور اس طرح اس کی زندگی کی گاڑی اسی راستے پر چل پڑی۔ اگرچہ اس کا دل اس کام پر آمادہ نہ تھا مگر آرجو کی پرورش کا مسئلہ سامنے تھا۔

اب وہ ہر روز آرجو کو گود میں لے کر اسی راستے پر بیٹھ جاتا جو سادر، ٹنگیل، مرزاپور اور میمن سنگھ بس اسٹینڈ کی طرف سے ہوتا ہوا گلستان سینما کے پیچھے اور رمنا ریسٹ ہاؤس کے سامنے سے گذرتا ہے اور پھر نوروکتاب والے کی دکان سے ہوتا ہوا محمد پور، گلشن اور مہاکھالی بس اسٹینڈ پر آکر مین روڈ سے مل جاتا ہے۔ یہ وہ شارٹ کٹ ہے جس کو ہر راہگیر وقت کی بچت کے لئے

استعمال کرتا ہے۔ اسی راستے پر ٹن کا ڈبا سامنے رکھے وہ تمام دن چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ ان دنوں دوسرے فقیر اس راستے پر نہ بیٹھتے بلکہ وہ گلستان سینما کے سامنے چکر لگاتے، مگر وہ کبھی اپنی جگہ چھوڑ کر نہ ہٹتا۔ وہ تمام دن بڑے سکون سے زمین کو تکتا رہتا اور آرجو اس کی گرد آلود داڑھی سے کھیلتا رہتا۔ اس کے چہرے پر ہمہ وقت بڑی غم انگیز سنجیدگی چھائی رہتی، اس لئے وہ عام فقیروں سے مختلف نظر آتا اور پھر دوسرے فقیروں کی طرح وہ راہگیروں کا راستہ کبھی نہ روکتا۔ بہت سے لوگ تو اس کی قناعت پسندی سے متاثر ہو کر اور معصوم آرجو کو گود میں دیکھ کر پیسے دے دیتے۔ وہ خود کبھی کسی سے پیسے نہ مانگتا اور نہ اپنی بیچارگی کا رونا روتا۔ شہر میں ہونے کے باوجود اس کے اندر گاؤں آباد تھا، جبھی تو وہ گاؤں کی ساری باتوں کو سینے سے لگائے ہوئے تھا۔

اس طرح آہستہ آہستہ وقت کی طنابیں، کھینچتی گئیں۔

پھر آرجو کافی بڑا ہو گیا اور علی میاں کی کمر پہلے سے بہت زیادہ جھک گئی۔ اس کی ساری آرزوئیں بیٹے میں سمٹ آئیں۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا جوان ہو کر مزدور بنے اور اپنی محنت کے سہارے زندگی گزارے۔ خود اسے بھیک مانگنے کی زندگی بالکل پسند نہ تھی، شاید اسی لئے وہ آرجو کو محنت کی زندگی بسر کرنے اور بری صحبت سے دور رہنے کی تاکید کرتا۔ وہ فٹ پاتھ کے کئی ایسے لڑکوں کو جانتا تھا جو چوری کرتے، جوا کھیلتے اور بسوں کی بھیڑ بھاڑ میں لوگوں کی جیب کاٹتے تھے۔ وہ آرجو کو ان لڑکوں سے، ہمیشہ دور رہنے کے لئے کہتا حتیٰ کہ کبھی کبھی وہ کلو اور خیرو کے بارے میں بھی انہیں باتوں کا اظہار کرتا جس پر آرجو روٹھ جاتا اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اچانک اس کی آرزوؤں کی دنیا ویران ہو گئی ہو۔

پھر ایک روز آرجو نے بابا کو بھیک مانگنے سے منع کر دیا۔ اچانک اتنی بڑی تبدیلی سے پہلے تو وہ ڈرا پھر اس نے بیٹے سے پوچھا.... اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا محنت مزدوری کرے گا تو اسے بڑی خوشی ہوئی اور وہ اس طرح مطمئن ہو کر جھگی میں بیٹھ رہا جیسے اسے ساری عمر کی کمائی کا صلہ مل گیا ہو۔ آرجو کام پر جانے لگا۔ کام ہی کیا تھا، بس موٹریں صاف کرنا یا پھر ٹنگیل اور میمن سنگھ جانے والے مسافروں کے بھاری بھرکم سامان اٹھا کر بس میں رکھ دینا! شام کو جب وہ واپس آتا تو اس کی جیب ریزگاری سے بھری ہوتی۔ علی میاں بیٹے کی جیب میں پیسے دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔

ایک شام آرجو مزدوری کر کے واپس آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تمام دن کی تھکن کے آثار

نمایاں تھے ۔ سارا جسم پسینے سے شرابور تھا ۔ راستے کے کنارے مرکنٹائل بینک کے قریب جوئے کی منڈلی جمی ہوئی تھی اور اس کے کچھ ساتھی بھی وہیں موجود تھے ۔ وہ کترا کر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ اتنے میں کسی نے آواز لگائی،

"ابے او دھوبی کے گدھے! کاہے کو جان دے رہا ہے؟ بیٹا ادھر آ! روپیہ کمانے کا آسان راستہ ہم لوگوں سے سیکھ ۔ تو جس مقصد کے لئے لمبے راستے پر بھاگ رہا ہے، وہ مقصد ہم ایک ہی قدم میں حاصل کر لیتے ہیں ۔" وہ لمحے بھر کے لئے ٹھٹھکا اور پھر اپنے ساتھیوں کے حالات پر غور کرتا ہوا آگے بڑھ گیا ۔

اسی طرح پھر ایک رات جب وہ گھر واپس آیا تو اس کی جیب روپیوں سے بھری تھی ۔ یہ روپے اس نے بابا کے سامنے بکھیر دیئے اور تن کر کہنے لگا،

"بابا! ہم انہیں روپیوں کے پیچھے زندگی بھر دوڑتے ہیں، مگر یہ ہمارے ہاتھ نہیں آتے ۔ لو آج یہ روپے تمہارے قدموں میں پڑے ہوئے ہیں ۔" علی میاں اس کی باتوں کو غور سے سن رہا تھا ۔ جیسے ہی اس نے اپنی بات ختم کی اور بابا کی طرف دیکھا، اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا ۔ علی میاں نے گرجتی ہوئی آواز میں پوچھا،

"اتنے روپے تجھے کہاں سے ملے؟ بول! بتاتا کیوں نہیں؟" علی میاں کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں ۔

"میں نے کمائے ہیں بابا!"

"ایک دن میں اتنے روپے کمائے ہیں تو نے! جھوٹ بولتا ہے ۔"

"نہیں نہیں بابا! میں جھوٹ نہیں بولتا ۔"

"تو پھر....؟"

"میں نے تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کر کے شیرو کے پاس رکھے تھے ۔ آج اس نے مجھے لوٹا دیئے ہیں ۔"

"سچ!"

"ہاں بابا! بالکل سچ ۔"

"مگر تجھے شیرو کے پاس رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"یونہی بابا! ہم دونوں نے پیسے جمع کرنے کی بازی لگائی تھی ۔ میں نے سب سے زیادہ جمع

کئے۔ "اور وہ مطمئن ہو گیا تھا" پھر اس نے آرجو کو سینے سے لگا کر کہا تھا،

"بیٹا! میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ عزت سے مرنا چاہتا ہوں۔ تو کوئی کام ایسا نہ کرنا کہ مجھے مرتے وقت شرمندگی محسوس ہو۔ یہی دکھ میرے لئے کیا کم ہے کہ میں تجھے محنت مزدوری کے پیسوں سے نہ پال سکا۔" اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

آرجو پر بھی ان باتوں کا بڑا اثر ہوا اور اس نے بابا سے وعدہ کیا کہ وہ ہمیشہ اس کی باتوں کا خیال رکھے گا۔

پھر وہ کئی روز تک کام پر نہیں گیا۔ اس عرصے میں وہ دوستوں سے بھی بہت کم ملا۔ کلو اور خیرو کئی بار اسے بلانے بھی آئے، مگر وہ ان کے ساتھ نہ گیا۔ علی میاں کو پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ اس کا بیٹا اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہا ہے۔ پھر وہ کام پر جانے لگا اور زندگی معمول پر آ گئی، مگر آج اچانک یہ کیا ہوا؟

وہ سوچتے سوچتے تھک گیا تھا۔ اس کے ذہن میں تمام پچھلی باتیں تازہ ہو گئی تھیں۔ اس نے شیرو کی طرف دیکھا۔ وہ انتہائی خاموشی سے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر نہ جانے کہاں سے اس کے ذہن میں شیرو کی آواز گونجنے لگی،

"آرجو کو پولیس لے گئی.... آرجو کو پولیس لے گئی!" پہلے تو یہ آواز دور کی آواز معلوم ہوئی، مگر پھر رفتہ رفتہ اتنے قریب آ گئی کہ اس کے ہوش اڑنے لگے۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ اپنی قمیض نوچ ڈالے اور گھر کا ایک ایک سامان اٹھا کر باہر پھینک دے۔ پھر جانے کیا ہوا کہ وہ شیرو کو بے تحاشا مارنے لگا۔ شیرو پریشان ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"کیا ہوا چاچا؟"

"نکل جا میرے گھر سے! تو نے ہی میرے بیٹے کو خراب کیا ہے۔ وہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ میرا بیٹا ہے.... وہ میرا بیٹا ہے۔" علی میاں کی آواز بھرا گئی اور وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جیسے اس کے اعتماد کو اس ماحول نے ڈس لیا ہو۔

(منشور۔ کراچی۔ ۱۹۶۹ء)

مجھ سے کہا تھا یادنے ــــــ!

جب شام ہوتی ہے اور دن ڈھلنے لگتا ہے تو سامنے دھندلکا ہوتا ہے، وقت پیچھے رہ جاتا ہے اور ماضی سائے کی طرح پاؤں سے لپٹ جاتا ہے۔ ایسے میں گزرے ہوئے وقت کو یاد کے آئینے میں دیکھنا اچھا لگتا ہے، ساری پچھلی باتیں ذہن کی اسکرین پر ابھرنے لگتی ہیں اور سامنے ماضی کے دریچے کھل جاتے ہیں۔

وہ بھی کیا دن تھے .... اجلے اجلے سے شفاف دن .... جب زندگی میں معصوم خوشیاں بھی تھیں اور چھوٹے چھوٹے سے انجانے دکھ بھی، جن کی کسک لمحہ بھر تو رہتی پھر معدوم ہو جاتی، جیسے انجانے میں لگی ہوئی شدید ٹھوکر پاؤں کے انگوٹھے کو لہولہان بھی کر گئی ہو، اور دل پر لگی چوٹ سے آنکھوں کے کٹورے کو جھر جھر آنسو بھی دے گئی ہو۔ پھر چند ہی لمحوں بعد خوشی کی کوئی بات دل کو بہلا کر دکھ کو کہیں دور لے جاتی اور روتی ہوئی معصوم آنکھیں یکبارگی ہنسنے لگتیں، گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو .... کہاں کی چوٹ اور کہاں کے آنسو ....؟ پھر کھیل کود میں مگن ہو کر سب کچھ بھول جاتا۔ سب بچوں کی طرح میرے بچپن کی دنیا بھی کتنی سادہ اور معصوم تھی! کبھی کھیل کھیل میں کسی دل دکھانے والی بات پر ایک دم سے رو دینا اور پھر روتے روتے خوشی کی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس دینا، زندگی لگتا۔ وہ سہانے دن کہاں کھو گئے ....؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے اماں کے انتقال پر میری آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکا تھا۔ لوگ حیران ہو کر کہتے، اس کو تو شاید سکتہ ہو گیا ہے۔ میں اماں کا بہت چہیتا تھا اور تمام بڑی بہنوں اور بڑے بھائی کی موجودگی میں سب سے چھوٹا۔ لاڈ پیار میں اماں مجھے کبھی اپنے سے جدا نہ کرتیں۔ انھیں یرقان کا موذی مرض لاحق تھا۔ دیسی علاج سے جب کوئی افاقہ نہ ہوا تو میرے بڑے ماموں امین الحق انھیں ڈاکٹری علاج کی غرض سے اپنے ساتھ مغلسرائے، جہاں وہ تعینات تھے، لے

گئے ۔ میں بھی ان کے ساتھ گیا ۔ آٹھ، نو برس کی عمر میں اپنے قصباتی گاؤں بھتری سے میں پہلی بار نکلا تھا ۔ میں اماں کے بغیر ایک پل کے لئے بھی کہیں نہیں رہتا ۔ میری ساری دنیا تو ان کی گود تھی، جبھی تو گھر والے حیران تھے کہ میں رو کیوں نہیں رہا ہوں ۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب اماں جانکنی کے عالم میں تھیں تو انوری آپا نے مجھے سوتے سے جگایا تھا، میں نے اٹھ کر اماں کو دو چمچے پانی پلائے تھے ۔ انھوں نے میری طرف دیکھ کر کچھ کہے بغیر آنسو بہائے اور سر سے پیر تک چادر تان لی تھی ۔ میں نے ان کے منہ پر سے چادر ہٹانا چاہی مگر دوسرے ہی لمحے ان کی گردن ڈھلک گئی ۔ وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو گئی تھیں ۔ گھر میں کہرام مچ گیا ۔ میں گم صم بیٹھا، جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا تھا ۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا ۔ انوری آپا نے سسکیوں کے درمیان بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا،

"بھیا! اماں چلی گئیں .... بہت دور .... جہاں سے اب وہ آپس نہیں آئیں گی ۔ " میں پھر بھی چپ رہا تو انھوں نے مجھے اپنی گود میں بھر لیا تھا،

"روتا کیوں نہیں .... رولے .... ! اماں کے لئے رولے .... ! " اس وقت تو شاید نا سمجھی کے سبب میں نہیں رویا تھا، مگر آج ان ساری باتوں کو یاد کر کے میرا دل رو رہا ہے ۔ وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئیں ۔ تب سے میں دنیا میں بالکل اکیلا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ مائیں تو سب کی اچھی ہوتی ہیں مگر میری اماں بہت ہی اچھی تھیں ۔ ان کی نیکیوں کو یاد کر کے گھر والوں کے ساتھ ساتھ محلے والے بھی رو رہے تھے ۔ وہ سارے گھر کو سونا کر کے چلی گئیں ۔

باہر صحن میں بہت ساری چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں ۔ لوگ تعزیت کے لئے آتے اور چپ چاپ بیٹھ جاتے ۔ بابا خاموش بیٹھے در و دیوار کو بڑی بے کسی سے تک رہے تھے ۔ میں بھی ایک چارپائی پر خاموش بیٹھا نیم کے اس درخت کو دیکھ رہا تھا، جو صحن میں میرے پرکھوں کی نشانی تھا اور جس کی گھنی چھاؤں میں میرا بچپن گزرا تھا ۔ مجھے یاد ہے کہ اسی نیم کے درخت پر ایک بار گرگٹ کو پکی اینٹ سے شکار کرتے ہوئے اسی کے تنے سے ٹکرا کر وہ اینٹ میرے سر پر آلگی تھی اور اس نے میرے سر میں شگاف ڈال دیا تھا اور خون کی ایک موٹی دھار سے میرے کپڑے سرخ ہو گئے تھے ۔ اماں کو جب خبر ہوئی تو وہ ننگے پاؤں گھر سے بھاگتی ہوئی میرے پاس آئیں اور میرے سر کو اپنے سینے سے لگا کر رونے لگیں ۔ پھر سر کے اس بڑے شگاف میں کپڑا جلا کر بھرا گیا تب کہیں جا کر خون بند ہوا پھر اس زخم کے اوپر مکڑی کا جالا لگایا گیا تا کہ زخم جلد مندمل ہو جائے ۔ اس چوٹ کا

نشان آج بھی میرے سر پر موجود ہے اور بچپن کی اس شرارت کی یاد دلاتا رہتا ہے۔

اماں مجھے پیار سے " بابو " کہتیں۔ شام پڑے جب میں دیر سے گھر لوٹتا تو وہ بے چین ہو کر دروازے پر کھڑی ہو جاتیں۔ کبھی گلی کے نکڑ پر آکر آواز دیتیں یا محلے کے کسی آدمی سے مجھے بلانے کے لئے کہتیں۔ میں محلے کے ہجولی لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں مگن رہتا۔ اکثر چاندنی راتوں میں اندھیرے اجالے اور آنکھ مچولی کا کھیل کھیلتا۔ شام کو گلی ڈنڈا، کبڈی یا گولی کھیلتا، بکریاں چراتا۔ میرا قصباتی گاؤں بہت خوبصورت تھا۔ اس کے ایک طرف اونچے اونچے پہاڑ نما ٹیلے تھے، جو بارش کے موسم میں ہریالی سے بھر جاتے اور حدِ نگاہ تک سبزے کی باڑھ نظر آتی۔ انھیں کے درمیان بڑے بڑے میدان تھے اور دور تک سرسبز کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر گانگی ندی بہتی تھی، جس کا پانی سیلاب کے زمانے میں میرے گھر کے قریب تک آجاتا۔ اس ندی کے ایک کنارے پر آموں کے باغات کا سلسلہ تھا، جس میں میرے بھی آم کے باغ تھے، اسی باغ میں مہوے کے درخت بھی تھے۔ پھلوں کے موسم میں، ہم صبح صبح مہوہ چننے باغ میں جاتے، جس سے مہوے کی روٹی پکتی۔ شدید گرمیوں کے زمانے میں جب لو چل رہی ہوتی تو میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ درخت کے پکے ہوئے آم، جو تیز ہوا کے جھکڑ سے ٹوٹ کر گرتے، انھیں، ہم لوٹنے جاتے۔ ان پکے ہوئے آموں کو، ہم ندی کے پانی میں دھو کر کھاتے، لو سے بچنے کے لئے ٹاٹ اوڑھے رہتے۔ پھر شام کو گرمی کی شدت سے تنگ آکر ہم ندی میں خوب نہاتے، تیرتے کپڑے دھوتے۔ اس زمانے میں نہ ہمیں لو لگنے کی پرواہ ہوتی اور نہ کسی بیماری آزاری کی۔ ننگے پیر، تیز دھوپ اور تپتی ہوئی زمین پر دوڑتے بھاگتے، گھر کے پالتو کتوں کو لے کر لومڑی اور گیدڑ کا شکار کھیلتے، شام کو اکھاڑے میں کشتی لڑتے، محرم کے عشرے میں تازیئے نکلتے، ماتم کرتے، رات رات بھر گتکے کھیلتے، دیوالی کا تہوار مناتے اور جب ساون کی جھڑی لگتی تو جھولے جھولتے۔ گاؤں کی لڑکیاں رنگ برنگے کپڑے پہنے جھولا جھولتیں، جوانی کی بہاریں لوٹتیں، عشق و محبت کے عجیب عجیب قصے سننے میں آتے، زندگی بڑی بیگانہ سی لگتی۔ نہ کھانے کا غم، نہ پہننے کی خوشی۔ جو مل گیا، سو مل گیا۔

اماں کے مرنے کے بعد میں، بہت تنہا ہو گیا تھا۔ انوری آپا، جو مجھ سے عمر میں چند سال بڑی ہیں، نے مجھے بہت سہارا دیا۔ میری دیکھ ریکھ کی ساری ذمے داری انھیں پر تھی۔ پھر ان کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے سسرال نیسارے (Naisara) چلی گئیں۔ اب میں اور بھی اکیلا ہو گیا۔ بابا اور میں گھر میں اکیلے رہتے۔ کچھ ہی دنوں بعد منن آپا، جن کے میاں نے انھیں لاولد ہونے

کے باعث طلاق دے دی تھی ، میرے گھر آگئیں ۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھیں ۔ ایک بار پھر طبیعت بہل گئی اور دن اچھے گذرنے لگے ۔ سب سے بڑی آپا کانپور میں تھیں ۔ وہ بہت کم آتیں ۔ بڑے بھائی جان کانپور ہی میں انھیں کے ساتھ رہتے تھے اور گاؤں بہت کم آتے تھے ، اپنی تنخواہ سے پیسے کبھی کبھار ہی بھیجتے ۔ بابا بوڑھے ہو گئے تھے اور اماں کے مرنے کے بعد تو وہ جیسے بجھ کر رہ گئے تھے ۔ ان کو حوصلہ دینے والا اور ان کی ڈھارس بندھانے والا کوئی نہ تھا ۔ زمینداری کا سلسلہ نہ ہونے کے برابر تھا ۔ سارے کھیت کاشتکاروں کے پاس تھے ، آدھی فصل مل جاتی ۔ اسی اناج غلے پر گزارہ تھا ۔ کہنے کو ہم انگریزوں کے زمانے کے ڈھائی آنے کے زمیندار تھے ، جس کے مطابق بہت سے کھیت جو کئی گاؤں میں پھیلے ہوئے تھے ، اپنی ملکیت تھے بڑے زمینداروں میں شمار تھا ۔ خوشحالی کے دن تھے ۔ پورے ضلع میں بابا اور اس خاندان کی بڑی عزت تھی ۔ مقدمہ بازی میں بھی ان کا کوئی ثانی نہ تھا انھوں نے شاید ہی کوئی مقدمہ ہارا ہو ۔ مجھے یاد ہے کہ کوٹھے کی نچلی منزل میں ، جہاں غلہ رکھنے کے لئے بہت بڑے بڑے مٹی کے بنے ہوئے کونڈے رکھے ہوئے تھے ، انھیں کے قریب لکڑی کا بنا ہوا بہت بڑا اور بہت بھاری صندوق رکھا تھا ، جس میں بابا کے مقدموں کی ساری فائلیں سرخ رنگ کے جزدانوں میں بندھی بے ترتیب پڑی تھیں ۔ بابا پڑھے لکھے بالکل نہ تھے ، بلکہ صرف اپنا نام لکھ لیتے تھے ، مگر اردو اتنی شستہ اور درست بولتے کہ کسی کو ان کے ان پڑھ ہونے کا گمان تک نہ ہوتا ۔ ان کی یادداشت اتنی اچھی تھی کہ ہر مقدمے کی فائل انھیں یاد رہتی اس زمانے کے بڑے بڑے وکیلوں سے ان کی دوستی تھی ، مگر اس مقدمہ بازی کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ زیادہ تر کھیت یا تو گروی رکھ دیئے گئے یا پھر اونے پونے فروخت ہو گئے اور ہندو کاشتکاروں نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا اور رفتہ رفتہ میاں لوگوں کی ساری جائیداد اور کھیتوں کے مالک بن بیٹھے ۔ پھر خاندان کی ناچاقی اور آپس کی پھوٹ نے سارا شیرازہ ہی بکھیر کر رکھ دیا ۔ بابا کے بھائیوں نے انھیں الگ کر دیا ۔ ایک کوٹھا اور چھوٹا سا آنگن ، جس میں بس ایک ہی اوسارا تھا ، ان کے حصے میں آیا ۔ گھر کے اس حصے میں ، جو اب میرا مکان تھا ، پہلے اناج غلہ ، جانوروں کے لئے بھوسا اور مویشی رہا کرتے تھے ۔ اماں نے اسے اپنے حصے کا گھر قبول کر کے اپنی محنت اور جانفشانی سے اس کو واقعی گھر بنا دیا تھا ۔ بڑی بے سروسامانی کی حالت میں بابا کے بھائیوں نے انھیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا ، مگر ان کی پیشانی پر بل نہیں آیا ۔ اماں ان سے بھی زیادہ صابر و شاکر تھیں ، انھوں نے اف تک نہ کی ۔ اس حالت میں بھی انھوں نے سارے گھر

کے لئے کھیتی باڑی کا سلسلہ جاری رکھا اور اپنی محنت کی کمائی سے پورے خاندان کی کفالت کرتے رہے، مگر دل کی اب وہ حالت نہ رہی تھی۔ سوچ و فکر اور اندرونی غموں کے سبب صحت گرتی چلی گئی۔ پھر میرے تایا، جن کو ہم لوگ "میاں جی" (یعنی مولوی عبدالغنی) کہتے، کافی ضعیف ہو چکے تھے، اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی آل اولاد ملازمت کی غرض سے شہروں کو سدھاری۔ دوسرے چچا آپس کی نااتفاقی اور جائیداد کے سبب دشمنی پر اتر آئے۔ ان کی جوان جہان اولاد تھی، ان سے آئے دن لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے، گھر کے بنگلے کو آگ لگائی جاتی، کھیتوں کی جوتائی اور بوائی پر لاٹھیاں چلتیں، مگر زمانے کی ٹھوکروں کے سبب زمینداری کا نشہ آہستہ آہستہ اترتا گیا، لیکن مقدمہ بازی پھر بھی ختم نہ ہوئی۔ میں نے جب ہوش کی آنکھ کھولی تو یہی کچھ دیکھا۔ بابا پھر بھی میاں جی کی اولاد کے ساتھ نباہ کرتے رہے۔ رہی سہی زمینداری کو شدید جھٹکا اس وقت لگا جب پاکستان وجود میں آیا، یعنی ۱۹۴۷ء کے بعد جب ساری زمینداری ختم کردی گئی اور کاشتکاروں کو زمین کا مالک بنا دیا گیا۔ میں نے زوال پذیری کا وہ دور بھی دیکھا ہے جب بابا خود اپنے سر پر دو دو من غلے کا بوجھ اٹھا کر گھر لاتے اور میں شام کے وقت اناج پسوانے کے لئے پانچ سیر کا بوجھ اٹھا کر آٹے کی پن چکی پر بازار لے جایا کرتا اور گھنٹوں قطار میں لگ کر آٹا پسوا کر میلوں میل پیدل چل کر گھر آتا۔ میں نے وہ وقت بھی دیکھا ہے، جب گھر پر ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے میسر ہوتی اور اکثر سوکھی روٹی کو پانی میں بھگو کر میرے منہ میں ڈالا جاتا۔ اس زمانے میں متوسط گھرانوں کا کم و بیش یہی حال تھا، جبھی سے تو سوچ اور فکر میرا مقدر بنی اور اماں کے گرم گرم آنسوؤں سے میرے رخسار آشنا ہوئے۔ مجھے جب شدید بھوک لگتی تو میں اماں کی گود میں سر رکھ کر روتا، مچلتا اور کھانے کے لئے ضد کرتا، ان کے چہرے کی طرف دیکھتا رہتا۔ اماں میرا ماتھا چومتی، سمجھاتی، کبھی بھوک کی طرف سے میرا دھیان بٹانے کی خاطر آسمان کی طرف اشارہ کرتی، جیسے من و سلویٰ کے انتظار میں ہوں۔ کبھی طرح طرح کے من گھڑت قصے سناتی، پانی پلاتی اور تسلی دے کر چپ کراتی۔ مجھ سے بڑی بہن انوری آپا جن کو میں نے اماں کے بعد سب کچھ جانا، دور بیٹھی روتی رہتیں۔ بابا اناج غلے کی فکر میں مارے مارے پھرتے، قرض کی سبیل نکالتے، کاشتکاروں کے پاس جاتے اور بچے کھچے کھیت گروی رکھ کر پیسے لاتے، تب ہانڈی چڑھتی۔ میں نے غربت و افلاس اور بھوک کو اتنے قریب سے دیکھا ہے کہ دنیا کے سارے بھوکے اور غریب میرے ماں جائے لگتے ہیں۔ یہ ہندوستان کے ان بیشتر گھرانوں کی بپتا ہے، جو آزادی کے فوراً بعد بڑی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں

میں اکثر چاندنی رات میں آنگن میں لیٹا کھلے آسمان پر چاند کو سفید اور سرمئی بادلوں کے درمیان تیرتا ہوا دیکھتا رہتا۔ پھر جب گھیرے سیاہ بادلوں کا ایک پہاڑ جیسا ٹکڑا چاند کو ہڑپ کر لیتا، تو میں ڈر کر بڑی اماں کی چارپائی پر بھاگ جاتا اور ان کے پہلو میں دبک جاتا۔ وہ نابینا تھیں اور ہم سب انھیں "بوا" کہا کرتے۔ وہ پوچھتیں کیا ہوا تو میں کہتا،

"بوا چاند کو کالے ڈراؤنے بادلوں نے نگل لیا اور دنیا پر اندھیرا چھا گیا۔" وہ ہنسنے لگتیں،

"ابھی پھر چاند آزاد ہو جائے گا اور روشنی پھیلے گی۔" پھر میں ان سے کہانی کی فرمائش کرتا وہ دیو پریوں کی کہانی سنانے لگتیں اور میں "ہوں"، "ہاں" کرتا رہتا، مگر جلد ہی نیند کی پریاں مجھے اپنے دیس میں لے جاتیں اور جب میری "ہوں"، "ہاں" بند ہو جاتی، تو اماں قریب کی چارپائی سے اٹھ کر مجھے چادر اوڑھا دیتیں اور میرا ماتھا چوم کر کہتیں،

"اے بوا! بابو کو نیند آرہی ہے، اب بس کرو۔ تم بھی سو جاؤ۔" اچھا کہہ کر وہ کروٹ بدل لیتیں اور ان کی ناک کے خوفناک خراٹے آنگن میں گونجنے لگتے۔ اکثر کچی نیند کے سبب میری آنکھ کھل جاتی اور میں چپ سادھے پڑا رہتا۔ اماں کل کے بارے میں بابا سے آہستہ آہستہ باتیں کرتیں .... بات ہی کیا ہوتی .... چولھے ہانڈی کے قصے ہوتے، جوان بہن کی شادی بیاہ کی باتیں ہوتیں۔ میں کھسر پھسر کی آواز سننے کی کوشش کرتا۔ اماں کہتیں،

"اناج ختم ہو گیا ہے، بابو کی فیس دینی ہے انوری کے لئے کپڑے بنانے ہیں، کھیت بکتے جا رہے ہیں، آخر کیا ہو گا!" کبھی کبھی بابا کی آواز گونجتی،

"اللہ مالک ہے۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔ اتنی فکر نہ کیا کرو!" بابا کروٹ بدل کر سو جاتے اور اماں سونے کے بجائے، اٹھ کر مرغیوں کی خبر گیری پر لگ جاتیں۔ وہ دڑبے پر پانی کا چھڑکاؤ کرنے لگتیں۔ گرمی کی شدت سے رات کو بھی مرغیاں چونچ کھولے "حق حق" کی مخصوص آواز نکالتیں۔ کبھی کبھار تو اماں ان پر ہاتھ کا پنکھا جھلتیں، ان کے دڑبے سے لگی باتیں کرتیں۔ انھوں نے ہر مرغی کے نام رکھ چھوڑے تھے،

"یہ ٹلیا ہے، یہ چتکبری ہے۔" اور نہ جانے کیا کیا۔ مرغیوں کا اتنا خیال رکھنے کی جو وجوہ اب میری سمجھ میں آرہی ہیں، ان میں ایک تو پرندوں اور بے زبان جانوروں سے ان کی بے پناہ محبت تھی اور دوسری شاید یہ کہ ان کے انڈوں سے سالن کی ہانڈی چڑھتی، مہمانوں کی تواضع کے لئے ان کے گوشت کام آتے اور گھر کی عزت بڑھتی۔ انھوں نے مرغیوں کے علاوہ بہت ساری

بکریاں بھی پال رکھی تھیں اور تمام بہنوں اور میرے نام کی ایک ایک بکری تھی ۔ ان کے بھی عجیب عجیب نام رکھ چھوڑے تھے، جواب یاد نہیں۔

ایک بکری کے بچے کو، جس کی ماں اس کی پیدائش کے وقت مر گئی تھی، انھوں نے اس نوزائیدہ بچے کو روئی کے بھاہے سے اور اپنی انگلی اس کے منہ میں ڈال کر دودھ پلایا تھا اور وہ زندہ بچ گیا تھا ۔ اسی بکری کی نسل سے بہت سی بکریاں اور بکرے بڑھے ۔ میں جب بچپن میں روٹھ کر بکریاں چرانے نہ جاتا اور کہتا کہ مجھے شرم آتی ہے تو وہ مجھے سمجھاتے ہوئے نصیحت کرتیں،

"ارے بیوقوف! حضورؐ نے بھی تو بکریاں چرائی تھیں ۔ یہ بے زبان جانور ہیں، ان کی دیکھ بھال سے ثواب ہوتا ہے ۔ پھر تو انھیں کا دودھ بھی تو پیتا ہے ۔ یہ نہ کھائیں گی تو دودھ کہاں سے دیں گی!" اور میں ان کی بات مان جاتا ۔ جانوروں کو بھی ان سے بے پناہ محبت تھی ۔ جس طرح وہ جانوروں کی تمام باتیں سمجھتی تھیں، اسی طرح جانور بھی ان کے اشارے پر چلتے تھے ۔ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی ہو کر وہ ایک مخصوص آواز نکالتے ہوئے "تی، تی، تی، تی" کہتیں تو بسواڑی میں، گھورے پر یا گھر کے قریب کے کھیت میں یا دور و نزدیک جہاں بھی مرغیاں دانہ دنکا چگ رہی ہوتیں، یا گھورے پر ٹھنڈی، نرم دھول سے "غسلِ خاکی" کر رہی ہوتیں، فوراً بھاگ کر ان کے پیروں کے آس پاس جمع ہو جاتیں ۔ اگر دانہ زمین پر نہ گراتیں تو پیار سے ان کے پاؤں پر چونچ مارتیں، خوش ہوتیں اور مرغا مست ہو کر کسی مرغی کے گرد رقص کرتا ہوا ایک نصف دائرہ بناتا یا پھر کھسیانا ہو کر ان میں سے کسی کو دبوچ لیتا، یا فوراً گردن ٹیڑھی کر کے بانگ لگا دیتا ۔ اماں ان کے ساتھ ساتھ یہ سب زیبا و نازیبا حرکتیں دیکھ کر نہال ہوتیں اور اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لئے ان سے عجیب عجیب باتیں کرتیں ۔ میں کھٹولے پر لیٹا یہ سب دیکھتا رہتا ۔ یہی چھوٹی چھوٹی سی انمول خوشیاں تو میرے غریب خانے کا سرمایہ تھیں اور شاید تمام غریبوں کے حصے میں یہی بے مانگے کی خوشیاں تو آتی ہیں، جو ان کی زندگی میں دو گھڑی کا سکھ ڈال جاتی ہیں ۔ گاؤں کی چھوٹی سی دنیا انھیں ننھی ننھی مسرتوں سے تو معمور ہوتی ہے ۔

ایک عجیب حیرت انگیز واقعہ اماں کے مرنے کے فوراً بعد پیش آیا ۔ جس بکری کو انھوں نے اپنی انگلی کے ذریعے دودھ پلایا تھا، اس کی آنکھ سے ہر وقت آنسو رواں رہتے ۔ وہ اتنی مغموم اور اداس رہنے لگی تھی کہ اس کی حالت دیکھ کر افسوس ہوتا ۔ کچھ دنوں بعد روتے روتے اس کی آنکھوں کی بینائی چلی گئی ۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا اور پھر ایک دن وہ بھی مر گئی ۔ مجھے اس کے

مرنے کا شدید دکھ ہوا۔ پھر ایک ایک کرکے اس کی ساری نسل ختم ہو گئی۔ بظاہر تو شاید اس پر یقین نہ آئے، مگر میں اس کا چشم دید گواہ بھی ہوں اور غمگسار بھی۔ یہ سچا واقعہ مجھے آج بھی یاد ہے اور میرے دل کے نہاں خانے میں درد کی کسک بن کر موجود ہے، گویا یہ بھی ایک کہانی ہو۔

مجھے بچپن میں باغبانی کا بڑا شوق تھا، جو آج بھی قائم ہے، مگر نہ بڑا سا آنگن نصیب ہے اور نہ کشادہ سا وسیع صحن، جہاں اس شوق کی تکمیل ممکن ہوتی۔ بے گھری کے دکھ میں یہ بھی تو ایک دکھ ہے، جس کو محسوس کرکے "لذتِ اضطراب" فزوں تر ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں میرے گھر کے باہر ایک بڑا سا قطعۂ آراضی تھا، جو ویران پڑا رہتا، اسی کے قریب ایک بہت پرانا کنواں تھا، جس کی جگت جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور بڑی حد تک مخدوش ہو چکی تھی۔ اس کا پانی پینے کے لئے استعمال نہ ہوتا کہ اسے برسہا برس سے صاف نہ کیا گیا تھا، مگر وہ پانی پیڑ پودوں اور صحن میں چھڑکاؤ کے کام آتا، کبھی کبھار نہانے دھونے کے لئے بھی استعمال ہوتا۔ اس وقت میری عمر دس یا بارہ برس کی رہی ہو گی۔ اصل تاریخ پیدائش کا تو نہ اس وقت علم تھا اور نہ آج ہے کہ اس زمانے میں گاؤں میں صحیح تاریخ پیدائش یا موت کا نہ تو کسی کھاتے میں اندراج کا بندوبست تھا اور نہ رواج .... بس سارا کام اندازے سے چلتا تھا۔ میں نے اماں کے مشورے سے اس جگہ سبزی ترکاری اور پھولوں کے پودے لگائے۔ تروئی کی بیل، سیم کی بیل اور میٹھے کدو (جسے ہم اپنی دیہاتی زبان میں کوہڑا یا کمڑا کہتے) کی بیل مچان پر خوب پھیلی۔ بیگن کے پودوں پر خوب بڑے بڑے بیگن لگتے۔ روزانہ صبح اٹھ کر اپنے باغ میں پانی دینا میرا معمول بن گیا تھا۔ اتنی سبزی ترکاری پیدا ہوتی کہ گھر کی ضرورت پوری ہو جاتی۔ گوشت کبھی کبھار سومن قصاب کے ہاں سے آتا۔ ویسے بھی آج تک وہاں کی دیہاتی زندگی کا دار، مدار سبزی ترکاری پر ہی ہوتا ہے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں غازی دادا کے مزار کے قریب اپنے اسکول جاتا، جہاں ہمارے ہیڈ ماسٹر ہری ہر بابو تھے، جو دھوتی باندھتے اور ایک سوتی بنڈی پہنے رہتے۔ وہ حساب پڑھاتے اور کند ذہن بچوں کو خوب مارتے۔ مولوی قمرالدین، ہمیں اردو پڑھاتے اور سرکنڈے کے قلم سے تختی لکھواتے۔ وہ بھی بانس کی کین سے بائیں ہاتھ پر مارا کرتے۔ اس اسکول میں، جو ایک اونچی سی جگہ پر ایک بڑے سے املی کے درخت کے سائے میں واقع تھا، میں نے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ حساب میں کمزور تھا، اس لئے اکثر مار پڑتی اور کبھی کبھی اسکول سے غائب بھی رہتا تھا۔

انھیں دنوں، ہمارے گاؤں میں ایک لحیم شحیم گیروا رنگ کی قمیض اور اسی رنگ کا تہہ

بند باندھے ایک فقیر بابا کہیں سے آنکلے اور میرے "محلے سپاہ" کی پرانی مسجد کے حجرے میں قیام پذیر ہوئے۔ ان کو لوگ "پنجابی بابا" کہتے۔ ان کے ساتھ ہمیشہ چند کتے ہوتے اور وہ ہر وقت مسکراتے اور آہستہ آہستہ کچھ پڑھتے رہتے۔ محلے کے گھروں سے ان کے لئے کھانا جاتا تو وہ کنکر پتھر، چینی کے برتنوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں سے، جسے گھس کر وہ خوبصورت بنالیتے، اپنی تھیلی سے نکال کر برتنوں پر جمی ہوئی میل کو صاف کر دیتے، جس سے اکثر برتنوں کی شکل بگڑ جاتی اور لوگ ان کے اس فعل سے ناراض بھی ہوتے۔ وہ بڑی خوش الحانی سے تلاوتِ کلام پاک کرتے اور رات رات بھر ہمارے قصبے بھتری کے مختلف مزاروں پر حاضری دیتے۔ غازی دادا کے مزار پر، "پیرانِ غیب" کے مزار پر اور اونچے ٹیلوں کی مخصوص جگہوں پر جاتے، فاتحہ پڑھتے اور پھر مسجد میں آکر فجر کے وقت تک عبادت کرتے۔ یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا جیسا کہ انھوں نے خود ایک بار مجھے بتایا تھا۔

ایک روز میرے ساتھ ایک بڑا عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں بکریاں چراتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اپنے حجرے میں بیٹھے ہوئے مٹی اور چینی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کی چھوٹی چھوٹی گٹیوں کو رگڑ کر خوبصورت بنانے میں مصروف تھے اور ان کو اپنی تھیلی میں جمع کرتے جاتے تھے۔ میں ان کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔ انھوں نے مسکرا کر دیکھا اور پوچھا،

"شربت پیوگے؟" پہلے تو میں نے کہا،

"ہاں! پیوں گا۔" پھر فوراً ہی میں نے پوچھا،

"مگر آپ کے پاس چینی تو ہے نہیں، پھر شربت کیسے بنے گا۔" وہ مسکرائے اور انھوں نے اپنا گلاس اٹھا کر کہا،

"جاؤ! مسجد کے مٹکے سے پانی لے آو۔" میں پانی لے آیا تو انھوں نے اپنی تھیلی میں، جس میں الا بلا بھرا ہوا تھا، ہاتھ ڈالا اور مٹھی بھر چینی نکال کر گلاس میں ڈال دی اور سامنے پڑے ہوئے چمچے سے خوب اچھی طرح ہلا کر کہا،

"پی جاؤ!" - میں غٹ غٹ پینے لگا۔ واقعی وہ شربت تھا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ میں نے شام کو گھر آکر یہ سارا ماجرا اماں کو سنایا۔ وہ بھی حیران رہ گئیں۔ اس دن سے "پنجابی بابا"، جنھیں اس زمانے میں، ہم لوگ "شاہ صاحب" کہتے تھے، پر ہمارا کامل یقین اور اعتماد ہو گیا کہ وہ ضرور پہنچے ہوئے بزرگ ہیں، اور واقعی وہ تھے بھی۔ مجھ سے وہ بڑی محبت کرتے تھے، بلکہ میرے گھر

والوں اور خاندان کے دیگر افراد کو وہ بہت چاہتے تھے۔ ایک بار میں رات کو ایک پرانے کھنڈر کے قریب سے گذرتے ہوئے ڈر گیا اور مجھے خونی پیچش ہو گئی۔ سخت بخار آیا تو اماں نے فوراً شاہ صاحب کو بلایا، دم کرایا۔ انھوں نے تعویز دیا، پانی دم کر کے پلایا، تب کہیں جا کر میری طبیعت ٹھیک ہوئی۔ شاہ صاحب کو کتوں کی وجہ سے گاؤں کے کچھ لوگوں نے بہت تنگ کیا تو انھوں نے وہ مسجد چھوڑ دی اور جامع مسجد کے حجرے میں منتقل ہو گئے۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا،
"یہ لوگ چاہے کچھ بھی کر لیں، مگر میں یہ گاؤں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ مجھے حکم نہیں ہوا ہے۔" میرے پاکستان آجانے کے بعد ان کی بڑی بڑی کرامات ظاہر ہوئیں اور انتقال کے بعد اسی گاؤں میں پیران غیب کے مزار کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ مجھے وہ بہت یاد آتے ہیں اور جب بھی میں گاؤں جاتا ہوں تو ان کے مزار پر ضرور حاضری دیتا ہوں، دل کی مراد مانگتا ہوں۔ اور فاتحہ پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے شاہ صاحب سے جو کچھ مانگا تھا، وہ سب مجھے مل گیا ہو۔ وہ میرے دل میں آباد ہیں۔

بزرگوں کی عزت کرنا، پیروں فقیروں کی صحبت میں رہنا، ان کے کہے پر عمل کرنا، میں نے اپنے بڑوں سے سیکھا ہے اور یہ میری تربیت کا ایک اہم جزو ہے۔ اماں اپنے دروازے سے سائل کو کبھی مایوس نہیں لوٹاتی تھیں۔ حاجت مند کی حاجت روائی ان کے مزاج کا خاصہ تھی، نماز روزے اور صوم وصلوۃ کی بڑی پابند تھیں، مصیبت میں کبھی پریشان نہیں ہوتی تھیں۔ مغرب کی اذان سے قبل ہمیشہ دروازہ بند رکھنے کی تاکید کرتیں اور نصیحت کرتیں کہ اس وقت بلائیں گھر میں داخل ہو کر پریشانی اور مصیبت کا سبب بنتی ہیں، اسی طرح صبح صادق کے وقت گھر کا دروازہ کھول دینا چاہئے کہ اس وقت روزی اور اللہ کی برکت کا نزول ہوتا ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی سی باتوں کی حقیقت خواہ کچھ بھی ہو، مگر یہ نصیحت آمیز باتیں میرے اعتقاد میں پختہ ہو گئی ہیں، میں خود ان باتوں پر عمل کرتا ہوں اور گھر کے دیگر افراد اور بچوں کو اس کی پابندی پر مجبور کرتا ہوں، جب کہ ہمارا آج کا معاشرہ ان باتوں سے بے بہرہ ہو چکا ہے۔ وہ ساری پرانی قدریں اب رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہیں اور انسان کچھ کا کچھ ہوتا جا رہا ہے۔

میرے محلے میں ایک حافظ مقبول ہوا کرتے تھے، جن کا ہمارے گھر میں بہت آنا جانا تھا۔ اماں ان کی خبر گیری بڑی تندہی سے کرتیں، شاید ان کا ہمارے گھر سے ایسا ناتا بن گیا تھا کہ وہ ہر وقت ہمارے ہی یہاں رہتے۔ حافظ قران تو تھے ہی، مگر بڑے خوش الحان تھے۔ اماں کو گھر کی

مصروفیت سے جب ذرا فرصت ملتی تو وہ ان سے نعتیں سنتیں اور حضور کی محبت میں سرشار ہو کر وجد میں آجاتیں اور رونے لگتیں۔ محبت و عقیدت کے ان بیش بہا موتیوں کو میں چپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہتا، کبھی ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتا اور خود بھی گنگنانے لگتا۔ مجھے بچپن میں گانے کا شوق بھی انھیں نعتوں کو سن کر پیدا ہوا۔ حضرت بہزاد لکھنوی کا یہ شعر تو حرزِ جان بنا رہتا:

اے جذبۂ دل ! گر میں چاہوں ، ہر چیز مقابل آ جائے

منزل کے لئے دو گام چلوں ، اور سامنے منزل آ جائے

اماں کی محبتوں کا حصار بڑا وسیع تھا اس میں ظہور نائی اور اس کی بوڑھی ماں جو آج بھی زندہ ہے کے علاوہ اور نہ جانے کتنے لوگ سمائے رہتے، چند برس پہلے جب میں اپنے گاؤں گیا تھا تو وہ مجھے اپنے کلیجے سے لگا کر اتنا روئی تھی کہ اس کے ساتھ میری بھی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ وہ کہتی جارہی تھی،

"ارے بچوا۔! تو میرے گود کا کھلایا ہوا ہے۔ تیری ماں کے جو مجھ پر احسانات ہیں، وہ میں کیسے بھلا سکتی ہوں۔" اس نے اپنے آنچل سے آنسو پونچھ کر میری بلائیں لی تھی اور مجھے اپنے بالکل قریب بٹھایا تھا اور محلے سپاہ کے مشہور حلوائی (جس کا نام اب یاد نہیں) کی دکان سے بالو شاہی، جو آج بھی بہت مشہور ہے، منگوا کر اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے کھلائی تھی اور ایسی نہال ہو رہی تھی، جیسے اس کا اکلوتا بیٹا برسوں بعد اسے مل گیا ہو، میرے وجود پر اس کی چاہت کی ایسی پھوہار پڑ رہی تھی کہ میرا رواں رواں اس میں نہا رہا تھا۔ اس کی عمر نوے برس سے اوپر تھی۔ پتا نہیں اب وہ زندہ بھی ہے کہ مر گئی، مگر اس کی خلوص بھری چاہت نے میرے دل میں جو گھروندا بنایا ہے، وہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ اسی طرح قمر الدین جولاہے کے گھر والوں سے اماں کے جو مراسم تھے، وہ اپنے اپنے سے لگتے۔ دھوبی نے بھی اس گھر سے محبت کی جو سوغات پائی تھی، وہ بھی اسے یاد کر کے دور خلاؤں میں دیکھنے لگتا، جیسے اماں عرش سے اتر کر اس کے سامنے کھڑی ہوں اور اپنے تمام چاہنے والوں کے درمیان اپنے بیٹے کو دیکھ رہی ہوں۔

اماں جب تک زندہ تھیں، تمام باتوں کے علاوہ میری زندگی کا معمول یہ تھا کہ میں گرمی کے دنوں میں آنگن میں چارپائی پر لیٹا کھلے آسمان پر چاند تاروں کو دیکھا کرتا اور ان کے بارے میں سوچتا رہتا۔ چرخا کاتتی ہوئی چاند کی بڑھیا کو غور سے دیکھتے دیکھتے میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔ سوچنے کی عادت مجھے اسی زمانے سے پڑی۔ نئی چیزوں کے جاننے کی جستجو مجھے لئے لئے پھرتی۔

بوا (بڑی اماں) سے کہانی سننا اور آسمان کی وسعتوں میں کھو جانا، اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینا، میرا معمول تھا۔ مجھ سے پہلے گھر میں جتنی آسودگی اور خوشیاں تھیں، وہ میرے باشعور ہونے تک رخصت ہو چکی تھیں۔ اماں بتاتی کہ میرے بڑے بھائی محی الدین صدیقی نے، جن کو ننھیال والے پیار سے "مٹرو" کہتے، بہت اچھے دن دیکھے تھے۔ ان کو زندگی کی ساری آسائشیں میسر تھیں، شاید اسی لاڈ پیار کے سبب وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ مڈل اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ ان کی اردو اور انگریزی کی تحریر انتہائی عمدہ اور پختہ تھی، حساب بھی بہت اچھا تھا، جبھی تو وہ جب بھی مجھے حساب پڑھانے بیٹھتے تو اکثر مارتے بھی تھے۔ حساب میں، میں ہمیشہ سے کمزور رہا اور اسی وجہ سے میٹرک میں، میں فرسٹ ڈویژن نہ لا سکا، کیونکہ سب سے کم نمبر اسی مضمون میں آئے تھے۔ انھوں نے ملازمت میں ترقی حاصل کرنے کے لئے بہت بعد میں میٹرک پاس کیا۔ خاندان میں زیادہ پڑھے لکھوں کی تعداد بہت کم تھی۔ شاید میں ہی خاندان کا واحد فرد ہوں، جس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اردو اور انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے۔ کا امتحان پاس کیا اور ساتھ ساتھ ملازمت بھی کرتا رہا۔

بچپن ہی سے غور و فکر میری عادتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں پورے خاندان کے ساتھ بیل گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گاؤں سے بہت دور ایک دوسرے گاؤں میں مسلم لیگ کے نمائندے کو ووٹ ڈلنے اپنے والدین کے ساتھ گیا تھا اور سارا دن بھوکا پیاسا رہا تھا پھر جب اسی حلقے سے مسلم لیگ کا نمائندہ کامیاب ہوا تھا تو گاؤں میں بڑی خوشیاں منائی گئی تھیں۔ بابا کے حلقہ اثر میں کافی لوگ تھے، اس لئے انھیں کانگریسی نمائندے کے مقابلے میں مسلم لیگ کے نمائندے کو اکثریت سے کامیاب کرانے پر بڑی مبارکباد ملی تھی۔ ہر شخص کا چہرہ فرطِ مسرت سے دمک رہا تھا۔ پھر پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد میرے بھائی نے پاکستان جانے کے لئے فارم بھر دیا تھا۔ وہ اس زمانے میں آرڈیننس فیکٹری کانپور میں ملازم تھے اور انھیں "آپٹی" (Optee) کی حیثیت سے آرڈیننس فیکٹری واہ کینٹ سابق مغربی پاکستان میں جوائن کرنا تھا، مگر اماں کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے جانے نہ دیا۔ پھر ان کی شادی ہو گئی اور وہ کچھ دنوں تک بیکار رہنے کے بعد اپنے بڑے سالے جمیل احمد صدیقی مرحوم کے پاس کشور گنج ضلع میمن سنگھ، مشرقی پاکستان چلے آئے اور پوسٹ آفس کے محکمے میں از سرِ نو ملازمت حاصل کر لی اور کچھ عرصے کے بعد ڈھاکا چلے آئے۔

پھر اماں کے انتقال کے بعد بھائی جان تعزیت کے لئے گاؤں آئے اور کچھ دن قیام کرنے کے بعد بابا سے اجازت لے کر مجھے اپنے ساتھ مشرقی پاکستان لے آئے۔ ان دنوں میں چھٹی جماعت میں ہندی میڈیم سے تعلیم حاصل کر رہا تھا اور گاؤں سے کئی میل دور دیوکلی کے مڈل اسکول میں پڑھنے جایا کرتا۔ بھائی جان کو میری پڑھائی کی زیادہ فکر تھی، کیونکہ ہندوستان میں اردو کی تعلیم تقریباً ختم کر دی گئی تھی اور مسلمانوں کو پاکستان جانے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ میرے ہندو ساتھی اکثر طعنہ دیتے کہ پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے، اب تو مسلمانوں کا علیحدہ وطن بن گیا ہے۔ اس طعنے سے ذہن کو جھٹکا لگتا اور اپنا وطن چھوڑنے کو جی نہ چاہتا، مگر ناچار بہتر مستقبل کی خاطر ایسا کرنا پڑا۔

اس طرح ۱۹۵۱ء کے آخر میں بھائی جان کے ساتھ میں مشرقی پاکستان کے لئے عازم سفر ہوا اور پہلی ہجرت مقدر بنی۔ بے گھری کے دکھ کا یہ پہلا تجربہ تھا، جس نے زندگی کی کایا پلٹ دی اور اپنے معصوم ذہن کو آنے والے دکھوں اور تجربوں کے لئے تیار کرنا پڑا۔ آج جب میں یادوں کے دریچے سے ذہن کی طلسماتی دنیا میں جھانکتا ہوں، تو مجھے گاؤں کی کچی سڑک پر بھاگتا ہوا تانگہ اور اس پر بیٹھے ہوئے دو مسافر نظر آتے ہیں۔ نئی زیر تعمیر کچی سڑک کے دونوں جانب آموں کے باغ کا ایک سلسلہ ہے، جو پیچھے کی طرف بھاگتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ دھول کا اڑتا ہوا غبار میرے تعقب میں ہے اور اسی غبار کے درمیان ایک لڑکا تیزی سے دوڑتا ہوا میری جانب کچھ دینے کے لئے بڑھ رہا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں نے دھند بھر دی ہے۔ میں پیچھے مڑ کر کبھی اسے اور کبھی اپنے گاؤں اور گھر کو دیکھتا ہوں تو بے اختیار میرا جی چاہتا ہے کہ دوڑ کر اس سے جا ملوں اور کبھی جدا نہ ہو سکوں۔ میرا بچپن مجھے آواز دے رہا ہے۔ ایک ایک چیز کے بچھڑنے کا غم دل پر بھاری بوجھ بنا ہوا ہے۔ میں نے دیکھا، اس کے ہاتھ میں نیلے رنگ کا چشمہ، کفلنگ اور ایک قلم ہے۔ وہ اسٹیشن تک میرا پیچھا کرتا ہے، پھر جب تانگہ رکتا ہے تو وہ مجھ سے لپٹ جاتا ہے۔ ہم دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں اور ہماری زبانیں گنگ ہیں۔ وہ کچھ کہے بغیر اپنی یادگار میری طرف بڑھا دیتا ہے۔ میں اور بھی بے اختیار ہو جاتا ہوں۔ یہ میرے بچپن کا دوست دلشاد ہے، جس کی دوستی کی سوغات کو میں نے آج تک سنبھال کر رکھا ہے۔ ٹرین روانہ ہو رہی ہے۔ میری جنم بھومی مجھ سے بچھڑ رہی ہے۔ دلشاد کا ہوا میں لہراتا ہوا ہاتھ مجھے الوداع کہہ رہا ہے۔ میں اتنی دور جا رہا ہوں، جہاں سے واپس آنا میرے بس میں نہیں۔ میں اپنے دیار کی تمام چیزوں کو حسرت سے دیکھتا ہوں۔ کتنے برسوں بعد

اب بھی جب میں آنکھیں، بند کر کے سوچتا ہوں، تو سب کچھ میرے حافظے کے لوح محفوظ پر واضح نظر آتا ہے۔ ایک ہاتھ فضا میں لہراتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ایسا لگتا ہے، جیسے کل کی بات ہو۔

۱۹۵۲ء کے وسط میں میرا کلاس سیونتھ میں نواب پور گورنمنٹ ہائی اسکول ڈھاکے میں داخلہ ہوا۔ داخلہ فارم پر کرتے وقت بھائی جان نے اندازے سے میری عمر ۲۲ جولائی ۱۹۳۹ء درج کر دی اور پورا نام زین الدین احمد صدیقی لکھ دیا اور گارجین کے خانے میں اپنا نام محی الدین صدیقی لکھ دیا۔ ان دنوں میں بھائی جان کے ساتھ ایک کمرے کے کرائے کے مکان میں ڈھاکشیوری میں رہتا تھا، جو ان کے دوست کو گورنمنٹ کی طرف سے ملا تھا۔ یہ مکان میرے اسکول سے بہت دور تھا اور میں ریلوے لائن کے کنارے کنارے روزانہ اسی راستے سے اسکول جاتا اور پھر شام کو واپس آتا۔ ساتویں جماعت کے تمام مضامین میرے لئے بالکل نئے اور قدرے مشکل تھے اردو بھی مشکل تھی کہ میں ہندی پڑھ کر آیا تھا۔ ٹیوشن کا رواج نہ تھا۔ تمام مضامین کے نوٹس ایجاد نہ ہوئے تھے۔ بھائی جان سے بہت ڈرتا تھا کہ وہ نہایت سخت گیر اور غصور تھے، اور جب بھی پڑھانے بیٹھتے، ذرا ذرا سی غلطی اور کوتاہی پر مارتے تھے۔ میں اکثر تنہائی میں روتا اور کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ بڑی اذیت ناک زندگی تھی! اسکول سے آنے کے بعد نماز پڑھتا، کچھ ناشتا مل جاتا تو کر لیتا، ورنہ اکثر بھوکے پیٹ ہی پڑھنے بیٹھ جاتا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اوسارے میں بیٹھا پڑھتا رہتا۔ بھائی جان کی تاکید تھی کہ زور زور سے آواز نکال کر پڑھو، اس کا ایک مقصد شاید یہ تھا کہ غلط لفظ کے تلفظ کی وہ اصلاح کرتے جاتے اور دوسرا یہ کہ میں اور کسی آواز پر کان نہ دھر سکوں، بس اپنے میں مگن ہو کر رٹا لگاتا رہوں۔ تمام مضامین کا سبق روز پڑھنا پڑتا اور اگلے دن کا سبق بھی دیکھ کر اسکول جانا ہوتا۔ رات کے دس، گیارہ بجے تک میری آواز گھر کے در و دیوار سے ٹکراتی رہتی۔ اسکول میں مولوی عبدالرشید صاحب کا سخت رویہ تھا۔ وہ درجہ نہم تک خوشخطی لکھواتے اور اکثر سزا دیتے۔ ثروت حفیظ صاحب انگریزی پڑھاتے تو اردو کا ایک لفظ بطور معنی بھی نہ بتاتے۔ ان کا رعب و دبدبہ بھی ذہن پر سوار رہتا۔ واحد خیری صاحب، البتہ، فارسی پڑھاتے بھی اور ہنساتے بھی۔ اور ادیب صاحب اچھے سے اچھے سوال کا جواب لکھنے پر بھی چالیس نمبر سے کبھی زیادہ نہ دیتے اور سختیاں الگ کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ساتویں جماعت کے پہلے ششماہی امتحان میں اردو میں فیل ہوا تھا اور کل تیس نمبر ملے تھے، پھر اس کے بعد ہمیشہ ساٹھ نمبر سے زیادہ ہی حاصل کئے اور شب و روز کی محنت کے سبب میں درجہ

نہم میں چند اچھے طلبا کی صف میں شمار کیا جانے لگا تھا اور اچھے اور غریب طالبِ علم ہونے کی وجہ سے میری آدھی فیس معاف کر دی گئی تھی۔ اس طرح میری پڑھائی کا سلسلہ چلتا رہا۔ پھر ہم فقیرا پل کی غریب آبادی میں منتقل ہو گئے، جہاں سے اسکول نسبتاً قریب تھا۔ یہاں بھی بھائی جان نے اپنے ایک سسرالی رشتے دار محترم مسعود عالم جمالی کے ساتھ مل کر دو کمرے کا مکان کرائے پر لیا۔ یہ کچی مٹی کی دیواروں پر بنا بانس کے ٹٹر یا درما سے بنا ہوا مکان تھا، جس کے اوسارے میں ٹاٹ بچھا کر کبھی لالٹین اور کبھی مٹی کے تیل کی ڈھبری جلا کر میں پڑھتا رہتا۔ میری دنیا بڑی چھوٹی سی تھی، جس میں غربت و افلاس کے چرچے اور چرکے، دونوں ہی رہا کرتے۔ میری کوئی خواہش نہ ہوتی۔ گھومنا پھرنا، سیر و تفریح، سینما، تھیٹر کو تو میں ترستا ہی رہتا۔ ہاں! اتنا ضرور تھا کہ کبھی کبھار گھر سے باہر کھلے میدان میں تنہا بیٹھ کر گاتا اور جب جی بھر آتا تو رو لیتا۔ مجھے اپنا گاؤں ایسے عالم میں بہت یاد آتا۔ میں بابا کو یاد کرتا اگرچہ میں بچپن میں ان سے بہت قریب نہ تھا اور وہ مجھ سے بظاہر لاڈ پیار بھی نہیں کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے مغرب کی اذان سے قبل گھر نہ پہنچنے پر خوب مارا بھی تھا، جس کے سبب ان کی طرف سے میرے دل میں خوف بیٹھ گیا تھا اور میں ان سے بہت ڈرتا تھا۔ کبھی کوئی بات یا دلی خواہش کا اظہار تک ان سے نہ کرتا، مگر اماں کے نہ ہونے کے سبب ان کو بہت یاد کرتا اور میرے دل میں اکثر خواہش پیدا ہوتی کہ اے کاش! وہ آکر مجھے یہاں سے اپنے پاس لے جاتے۔! پھر بھائی جان کو موتی جھیل گورنمنٹ کالونی میں مکان الاٹ ہو گیا اور ہم لوگ اس میں منتقل ہو گئے، مگر یہاں بھی کافی عرصے تک ایک ہی کمرہ بھائی جان کے حصے میں آیا، اور دوسرے کمرے میں میری بیوی حمیدہ خاتون اور اس کے بھائی چٹگام سے آکر بحیثیتِ کرایہ دار رہنے لگے۔ اس وقت میری شادی نہیں ہوئی تھی، مگر خاموش محبت کی ابتدا ہو چکی تھی، جو خط و کتابت اور تاک جھانک تک پہنچ چکی تھی۔ یہ میری پہلی محبت تھی، جس نے مجھے ذہنی اعتبار سے سہارا بھی دیا، میری تنہائی کو دور بھی کیا اور مجھے سوچ و فکر کی دولت سے مالا مال بھی کیا۔ بوریا نشینی کا دور ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں تیسری منزل کی سیڑھی کے پاس تھوڑی سی جگہ میں ٹاٹ بچھا کر زور زور سے پڑھتا رہتا۔ گھر میں تیز آواز سے ریڈیو بھی بجتا۔ بچے شور بھی کرتے اور بھائی جان کی اپنے بچوں پر ڈانٹ ڈپٹ بھی جاری رہتی۔ جس سے تنگ آکر میں گھر کا دروازہ بند کر لیتا اور چالیس پاور کے بلب کی مدھم روشنی میں پڑھتا رہتا۔ اس زندگی کے بارے میں اب جب بھی تصور کرتا ہوں تو دکھ کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے۔ ہندوستان سے لے کر مشرقی پاکستان تک دکھ کا جو ساتھ ہوا تھا، وہ

بدستور قائم تھا اور زندگی بن گیا تھا۔

۱۹۵۷ء میں میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا اور کھلی فضا میں سانس لی۔ اب میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں تک آزاد اور بیکار رہا۔ پڑھائی سے وقتی طور پر نجات مل گئی تھی۔ کالج میں داخلہ لینے کی استعداد نہ تھی۔ بھائی جان نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا،

"اگر آگے پڑھنے کی خواہش ہے تو خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرو، ملازمت کرو اور پھر پڑھو۔ میں اب تمھارے کالج کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔ میری آمدنی محدود ہے اور اخراجات زیادہ۔" ان کی اس صاف گوئی نے ایک بار پھر مجھے اندر سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور مجھے اماں اور بابا اس لمحے بہت یاد آئے تھے۔ وہ کثیرالاولاد تھے۔ ان کی بہت معمولی سی ملازمت تھی، جس کے سہارے وہ میری پڑھائی کا بوجھ سہارنے کے قابل نہ تھے۔ میں ایک بار پھر گم صم رہنے لگا۔ اکثر تنہائی میں بیٹھا اس قدر سوچتا کہ میری آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ مجھے آگے پڑھنے کی بڑی خواہش تھی۔ میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے باوجود کالج میں داخلہ نہ لینے کی وجہ جب ہمارے اسکول کے چند مخلص ساتھیوں کو معلوم ہوئی، تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ میں شرم کے مارے ان سے کتراتا تھا۔ اس زمانے میں، میں بہت شرمیلا اور کم گو تھا۔ غربت نے ساری قوتِ گویائی کو محدود کر دیا تھا۔ پھر انھوں نے آپس میں مشورہ کر کے ہم سب کے ایک مشترکہ ساتھی عبدالرزاق سے، جو کاروباری گھرانے کا چشم و چراغ ہے، اس بات کا ذکر کیا۔ اس نے اپنے والد عبدالعزیز صاحب سے اجازت لے کر داخلے کے تمام اخراجات دینے کی حامی بھر لی، پھر اس کو ساتھ لے کر اسکول کے تین، چار مخلص دوست اور ساتھی، جن میں خورشید احمد مرحوم، انور حسین، مطیع الرحمان، معصوم اور ضیا احمد وارثی شامل تھے، میرے گھر آئے، مجھے گھر سے باہر لے گئے، ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر انھوں نے دبے لفظوں میں کچھ کہا اور رزاق کی طرف دیکھا (اسکول کے ساتھی اس زمانے میں مجھے "بڑے بھائی" کہتے تھے)۔ اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا،

"بڑے بھائی! ہم لوگوں نے سنا ہے کہ آپ کالج میں داخلہ نہیں لے رہے ہیں۔" میں شرمسار ہو کر چپ رہا تو اس نے کہا،

"میں نے اپنے والد صاحب سے بات کر لی ہے۔ وہ داخلہ فیس اور کالج کے دیگر اخراجات

کے لئے رقم بطورِ قرض خوشی سے دینے پر تیار ہوگئے ہیں ۔ آپ ہماری درخواست قبول کرلیں ۔ اس میں شرم کی کوئی بات نہیں ۔ جب آپ اس قابل ہو جائیں تو لوٹا دیجئے گا ۔ اس طرح آپ کا سال ضائع ہونے سے بچ جائے گا ۔" شرمساری کے احساس میں مسرت کا ایک نیا جذبہ پیدا ہوا ۔ میں نے خوش ہو کر کہا کہ اگر ایسا ہو جائے تو میرا مستقبل تباہ ہونے سے بچ جائے گا ۔ غالباً تیس روپے اس نے فوراً جیب سے نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیئے ۔ تمام دوستوں کی آنکھوں میں چمک تھی ۔ وہ اپنے نیک مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے اور بہت خوش تھے ۔ خورشید احمد مرحوم سب سے زیادہ مسرور تھا کہ اس کی کوششیں بارآور ثابت ہوئی تھیں ۔ خورشید ہمیشہ کلاس میں فرسٹ آتا تھا ۔ ساتویں جماعت میں داخل ہونے کے بعد میں نے اتنی محنت کی تھی کہ اپنے کلاس میں اس کے ہم پلہ آگیا تھا اور صرف چند نمبروں کی کمی کے سبب میٹرک میں میرا فرسٹ ڈویژن نہیں آسکا تھا، جبکہ اسکول کے تمام اساتذہ کو اس کی قوی امید تھی ۔

گھر آکر میں نے بھابھی کو ساری باتیں بتائیں ۔ وہ بہت خوش ہوئیں ۔ بھائی جان سے میں بہت خائف رہتا تھا، اس لئے ان سے کوئی بات نہ کرتا تھا ۔ وہ پرانی وضع کے سخت گیر اور منطقی ذہن کے انسان تھے ۔ تعلیم و تربیت کے معاملے میں اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی شیر کی آنکھ سے دیکھتے، مگر میرا بہت خیال رکھتے ۔ مجھے کھانا، ناشتا وقت پر نہ دینے کے باعث اکثر بھابھی سے ناراض ہو جاتے ۔ ان کی محبت کا انداز بالکل نرالا تھا ۔ آج وہ دنیا میں نہیں ہیں تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے میرا سب کچھ چھن گیا ہو ۔ میں ہمیشہ انھیں والد کی جگہ سمجھتا ۔ وہ مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے ۔ انھوں نے مجھے تعلیم کے زیور سے آراستہ کر کے انسان بنایا ۔ میں نے بھی ان کے جیتے جی علم حاصل کر کے ان کی تمام آرزوئیں پوری کیں ۔ مجھے کامیاب زندگی گزارتے ہوئے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے، شاید یہی ان کی تمنا بھی تھی اور اسی خواہش کے پیشِ نظر وہ مجھے پاکستان لائے تھے ۔

دوسرے ہی دن میں نے قائدِ اعظم کالج ڈھاکا میں شام کی شفٹ میں داخلہ لے لیا اور پھر کچھ ہی عرصے بعد مجھے ڈھاکا الیکٹرک سپلائی کمپنی میں میرے ایک عزیز محترم رضی احمد صدیقی کی معرفت ملازمت مل گئی اور پہلی ہی تنخواہ ملتے ہی میں نے بھائی رزاق کے والدِ محترم کو ان کی رقم لوٹا دی اور ان کا بے حد شکریہ ادا کیا ۔ بھائی رزاق کا یہ مجھ پر احسانِ عظیم تھا، جس کو میں تاحیات نہ بھلا سکوں گا ۔ اس بات کو کم لوگ جانتے ہیں اور اس نے بھی اس کا کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا ۔

ایسے محبت کرنے والے دوست اور ساتھی اب خال خال نظر آتے ہیں۔

اس طرح ملازمت اور پڑھائی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ میں نے زندگی میں بڑی جد و جہد کی ہے۔ صبح ساڑھے سات بجے گھر سے نکلتا تو رات کے گیارہ بجے گھر میں داخل ہوتا۔ لنچ کے وقفے میں ٹائپ سیکھتا تاکہ بہتر ملازمت مل سکے، مگر "لوہا کوٹنا" (ٹائپ سیکھنے کو میں لوہا کوٹنا کہتا تھا) میرے مزاج کے خلاف تھا، اس لئے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے بعد بھی میں ٹائپسٹ نہ بن سکا۔ ہاں! البتہ پاکستان ٹیلیگراف اینڈ ٹیلیفون ڈیپارٹمنٹ میں مقابلے کا امتحان پاس کرکے نئی ملازمت بحیثیت ٹیلیفون آپریٹر ضرور حاصل کرلی۔ اس طرح سفارش کی ملازمت سے مجھے نجات مل گئی اور سرکاری محکمے میں مستقل طور پر ملازم ہو گیا۔ میں نے زندگی میں کسی کا احسان بہت کم اٹھایا ہے اور ہمیشہ اپنی قوتِ بازو پر بھروسا کیا ہے۔ کسی کے کام آنے میں، میں خوشی محسوس کرتا ہوں، مگر دوسروں کے لئے اسے احسان کبھی نہیں سمجھتا۔ میں نے دوسروں کے دکھ درد کو ہمیشہ اپنا جانا ہے۔

اسکول کے زمانے سے ہی مجھے شعر و ادب سے لگاؤ پیدا ہوا۔ میرے اردو کے اساتذہ مولوی عبدالرشید صاحب، ادیب صاحب، واحد خیری صاحب اور کچھ دنوں کے لئے نظیر صدیقی صاحب نے بھی میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے اتنی شفقت اور محبت سے پڑھایا کہ مجھے اردو ادب سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ درجہ نہم میں، میں نے ایک مضمون بعنوان "میرا خواب" لکھا تھا، جس کی ادیب صاحب جیسے سخت گیر استاد نے بے حد تعریف کی تھی اور میرے بعد آنے والی کئی کلاسوں میں وہ اس مضمون کو پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ یہ میری پہلی حوصلہ افزائی تھی، جس نے اردو ادب سے میرے شغف کو فزوں تر کر دیا۔

(۲)

کالج کے زمانے سے ہی میں نے کہانی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہیں میری ملاقات ۱۹۵۹۔۶۰ء میں شہزاد اختر (جن کا اصل نام ابوالفضل انوار ہے اور جو تاحال ریڈیو پاکستان اسلام آباد میں ایک اہم عہدے پر فائز ہیں) اور عبدالحمید سوز حیدر آبادی سے ہوئی۔ ہم تینوں کے مزاج میں بڑی ہم آہنگی تھی۔ تینوں ہی متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور معاشرے کی ناہمواری اور ناانصافی پر گہری نظر رکھتے تھے۔ استحصالی قوتوں کے خلاف ہماری خاموش جنگ قلم کے محاذ پر جاری تھی۔ ترقی پسندی ہمارے مزاج کا خاصہ تھی، مگر دوسری جانب ادب میں نئے رجحانات اور جدید خیالات کا چرچا عام ہو رہا تھا، طرزِ فکر بدل رہی تھی، لیکن ہم خاموشی سے اپنا کام کئے جا رہے تھے۔ شہزاد اختر افسانہ نگار کی حیثیت سے خاصے معروف تھے۔ اور سوز حیدر آبادی ایک اچھے شاعر اور ڈرامہ نویس کی حیثیت سے اپنا مقام بنا رہے تھے۔ ان کے اکثر ڈرامے ڈھاکا میڈیکل کالج اسٹوڈنٹس یونین کے زیرِ اہتمام ہر سال اسٹیج ہوتے تھے۔ ہم تینوں نہایت بے تکلف دوست بھی تھے اور ایک دوسرے کے رازداں بھی۔ ہم نے "گوشہ ادب" کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کر رکھی تھی، جس میں ہم تینوں کے علاوہ اور کوئی بھی شامل نہ تھا اور نہ ہی اس خفیہ انجمن کی کسی کو خبر تھی۔ ہم ہر ہفتے بڑی پابندی سے ایک کہانی ضرور لکھتے اور ایک دوسرے کو سنا کر مشورہ لیتے۔ سوز مرحوم غزل کہتے یا پھر ڈراما لکھتے۔ شرط یہ ہوتی کہ اگر کوئی نہیں لکھے گا تو اس کو جرمانے کی شکل میں چائے ناشتا کرانا پڑے گا یا نقد رقم، جو غالباً پانچ یا دس روپے ہوتی، دینا پڑے گی۔ اس شرط کو پورا کرنے یا وعدہ نبھانے کی خاطر ہم کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے اور باقاعدگی سے سناتے۔ یہ اور بات کہ اس کے بعد چائے ناشتے کا بھی دور چلتا۔ اس زمانے میں اختر بے روزگار تھے، سوز الفا انشورنس کمپنی میں ملازم تھے، جس سے وہاں کی اہم شخصیت شیخ مجیب الرحمان بھی وابستہ تھے، لہٰذا مجھے یا سوز کو اس دن کے اخراجات برداشت کرنے پڑتے۔ پھر ہم سیگون باغیچے سے ہوتے ہوئے رمنا پارک بیلی روڈ اور کبھی ڈھاکا کلب کی جانب پیدل مارچ کرتے، کہانی کا پلاٹ سناتے، یا پھر ایک دوسرے کی "داستانِ محبت" سنتے۔ سوز مرحوم کچھ زیادہ ہی دل پھینک واقع ہوا تھا۔ کبھی وہ نئی واردات سناتا اور کبھی پرانی میں مزید ترقی و توسیع اور پختگی کا ذکرِ خیر کرتا۔ ہمارے "گرو دیو" شہزاد اختر تھے، جو ایک خاص انداز سے مسکراتے ہوئے کمال ضبط و تحمل سے سب کی باتیں سنتے

اور بڑے انوکھے مشورے دیتے، جن پر اکثر عمل بھی کیا جاتا۔ سوز مرحوم کو اسی عشق نے مارا۔ اس نے عین جوانی میں خود کشی کرلی۔ اس کی محبوبہ نے، جہاں وہ ٹیوشن پڑھانے جاتا تھا، قرآن کریم پر ہاتھ رکھ کر اس سے شادی کرنے کی قسم کھائی تھی، مگر والدین کے مجبور کرنے پر وہ کسی اور سے شادی کرنے پر تیار ہو گئی تھی اور اپنی قسم سے منحرف ہو گئی تھی، جس کی تاب نہ لاکر سوز نے اپنی جان دے دی۔ اس میں جسمانی طور پر یہ عیب تھا کہ اس کا ایک ہاتھ پیدائشی طور پر چھوٹا تھا اور وہ پستہ قد کا دبلا پتلا انسان تھا۔ اس جسمانی عیب کے باوجود ٹائپ بھی کرتا تھا، روانی سے لکھتا بھی تھا اور اکاؤنٹس کے کام کا ماہر تھا۔ شیخ مجیب الرحمان (سیاسی لیڈر اور بنگلہ دیش کے پہلے وزیر اعظم) اسے بہت پسند کرتے اور اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ اس کے جدا ہونے کا ہم دونوں کو شدید دکھ ہوا اور ہمارا "گوشہ ادب" ہمیشہ کے لئے ویران ہو گیا۔ سوز مرحوم کو میری شادی میں شریک نہ ہونے کا قلق تھا جو ۲۱ ستمبر ۱۹۶۹ء میں ہوئی جس کا ذکر اس نے مرنے سے ایک روز قبل میرے نام لکھے ہوئے اپنے آخری خط میں کیا تھا۔ جو آج تک میرے پاس محفوظ ہے اور مجھے اکثر رلاتا رہتا ہے۔

"گوشہ ادب" میں پابندی سے کہانی سنانے کی شرط کے زیر اثر میری پہلی کہانی "زندگی کے ساز پر" ۱۹۶۱ء میں "نصرت" لاہور میں شائع ہوئی اور پھر چھپنے چھپانے کا سلسلہ چل نکلا۔ اسی زمانے میں "انجمن ادب" قائم ہوئی، جس کے روح رواں بھائی صلاح الدین محمد تھے، جو بے باک صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ جدید فکر کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کی ولولہ انگیز قیادت میں، ہم نے "انجمن ادب" کے زیر اہتمام "سہ روزہ جشن امیر خسروؒ" اور "جشن بہاراں" ڈھاکا میں پہلی بار منایا، جس میں مغربی پاکستان کے تمام چیدہ چیدہ شاعروں اور ادیبوں نے شرکت کی اور شاہد احمد دہلوی مرحوم کو پکا راگ سناتے پہلی بار دیکھا۔ اس "انجمن" نے بھی کئی شاعروں اور ادیبوں کو نمایاں مقام دلایا۔ ہم سب اس کے فعال کارکن اور عہدیدار تھے اور مشرقی پاکستان میں فروغ زبان و ادب کا کام انتہائی تن دہی اور مستعدی سے کر رہے تھے۔

میرا قلمی نام بھی بھائی صلاح الدین محمد کا ہی تجویز کردہ ہے، جس کو میں نے ہمیشہ کے لئے اپنا لیا، اس سے پہلے میں سوز غازیپوری اور کیف مشرقی لکھا کرتا تھا اور شعر بھی کہتا تھا، مگر وہ نوجوانی کی ناسمجھی کا زمانہ تھا اور طرح طرح کے تخلص اختیار کرنا اچھا لگتا تھا۔ اپنے اصل نام سے "صدیقی" کا لفظ تو کسی اہل تشیع استاد کے مشورے پر بھائی جان نے ہٹوا دیا تھا کہ اس لفظ سے

امتحان کے کسی نتیجے کو گزند نہ پہنچے، جیسا کہ استادِ محترم نے فرمایا اور ڈرایا تھا اور تخلص کے جھنجھٹ سے صلاح الدین بھائی نے نجات دلوادی۔ اس کارِ خیر کا اجر انھیں ضرور ملے گا۔ ویسے بھی وہ آدمی بڑے کام کے ہیں، مگر نہ جانے ان کو کیا ہو گیا ہے اب تو ایسی چپ سادھ لی ہے کہ اللہ اللہ! مانو درویش ہو گئے ہیں۔۔ہم سب کو وہ بہت یاد آتے ہیں۔

ادب سے گہری دلچسپی کے باعث میں حلقہ اربابِ ذوق کی نشستوں میں، جو ڈھاکا یونیورسٹی کی "اولڈ آرٹس بلڈنگ" میں ہوتی تھیں، پابندی سے شرکت کرتا تھا، جس کی صدارت استادِ محترم ڈاکٹر عندلیب شادانی کیا کرتے تھے اور جس میں ڈھاکے کے بیشتر نمائندہ شاعر و ادیب شریک ہوتے تھے۔ مثلاً محترم ڈاکٹر حنیف فوق، ڈاکٹر کلیم سہسرامی، افسر ماہ پوری مرحوم، عطا الرحمان جمیل، جمیل عظیم آبادی، محترم شبیر علوی، حسین احمد، صلاح الدین محمد، ام عمارہ، بانو اختر شہود، احسن احمد اشک مرحوم، اختر پیامی اور کئی دوسرے شاعر و ادیب۔

۱۹۶۵ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے میں نے اردو میں ایم۔اے۔ کا امتحان پاس کیا اور محترم ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مشورے اور تائید سے پاکستان ایئر فورس کے شاہین اسکول میں جزوقتی ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے علاوہ پاکستان آبزرور گروپ آف نیوز پیپرز کے فلمی ہفت روزہ اخبار "چترالی" میں جزوقتی ملازمت کی۔بھائی صلاح الدین محمد کی معیت میں روز نامہ "پاسبان" میں کام کیا، ریڈیو پاکستان کے فورسز (Forces) پروگرام میں نیوز ریڈر اور مترجم کی حیثیت سے خدمات انجام دیں.... یعنی بیک وقت چار ملازمتیں کرتا تھا اور اپنے شوق کی تسکین کے لئے افسانے بھی لکھتا، فکاہیہ کالم بھی لکھتا، انگریزی سے اردو میں ترجمے بھی کرتا، دوستی بھی نبھاتا اور عشق بھی کرتا تھا۔ میں نے زندگی میں دو عشق کئے ہیں۔ ایک تو ملازمت کے دوران ہوا تھا، اور اس نے کافی سنجیدہ بھی کر دیا تھا (جس کا کچھ احوال میری کہانی "درد کی چاندنی" میں بیان ہوا ہے)، مگر اس راز کے افشاں ہونے سے پہلے ہی اس کی شادی ہو گئی۔ اس بنگالی خاتون نے نہ جانے کب سے مجھ میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ہم ایک ساتھ ایک ہی دفتر میں کام کرتے۔ روزانہ کا ملنا جلنا اور بے تکلف انداز میں گفتگو کرنا معمول تھا اور مجھے قطعی علم نہ تھا کہ وہ مجھ میں دلچسپی لے رہی ہیں۔ کچھ عرصے بعد کسی ذریعے سے مجھے اس کا علم ہوا۔ پھر کیا تھا "دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔" دوسرا عشق، جو ناسمجھی کے زمانے میں شروع ہوا تھا اور درمیان میں سماج کی دیوار آڑے آجانے کے سبب ختم بھی ہو گیا تھا، مگر خاندانی اور گھریلو قسم کا عشق تھا، سو وہ میری شادی

پر منتج ہوا اور "غالب والا پھندا" ۱۹۶۹ء سے مسلسل گلے میں پڑا ہوا ہے، مگر میں اسے ہر گز بوجھ نہیں سمجھتا۔ یہ تو میری پہلی محبت تھی، جو کامیاب ہوئی، اور اب تو زندگی میں ایسی رچ بس گئی ہے کہ ایک پل کو بھی دوری کا تصور نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی اب زندگی ہی کتنی رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ زندگی نے زیادہ خرافات کا موقع ہی نہیں دیا: "ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔"

قیامِ مشرقی پاکستان کے دوران میں، میں نے زیادہ کہانیاں لکھیں۔ وہاں کی سرزمین شعر و ادب کے لئے زیادہ سازگار تھی۔ بیس سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد اب زندگی میں ٹھہراؤ آچلا تھا۔ وہاں کی ہر چیز اپنی اپنی سی لگتی۔ خلوص و محبت کی فراوانی تھی۔ عمرِ عزیز کا بہترین وقت یہیں گزرا تھا، اس لئے اس سرزمین کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا، مگر ہمارے سیاسی طالع آزماؤں کی ناقص کارکردگی اور عاقبت نا اندیشی نے ایک بار پھر ہمیں بے گھری کے عذاب سے دوچار کر دیا اور ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ کے نتیجے میں قائداعظم کا (بلکہ ہم سب کا) پاکستان دولخت ہو گیا۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد فکر و خیال کا شیرازہ بکھر گیا۔ زندگی ایک نئے گرد باد کی اسیر ہو گئی۔ اس خونچکاں داستان کے اثرات ذہن و دل پر اس طرح حاوی رہے کہ تقریباً دس سال تک ایسا ذہنی جمود طاری رہا کہ تخلیق کی ساری راہیں مسدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ اگرچہ میں سقوطِ ڈھاکا سے چند ماہ قبل ہی "نئے پاکستان" میں آگیا تھا، مگر دوسری ہجرت کا کرب ذہنی انتشار کا سبب بنا رہا۔ زندگی کو از سرِ نو ترتیب دینا پڑا۔ بڑے مصائب اور مشکلات سے یارانہ رہا۔ تمام یارانِ طریقت بچھڑ گئے تھے۔ یہاں اپنا کچھ بھی نہیں تھا۔ تنکا تنکا چن کر دوبارہ آشیانہ بنایا پھر کہیں جا کر قلم کی رفاقت نصیب ہوئی۔ ۱۹۷۶ء میں کراچی یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے۔ کیا۔ بہتر ملازمت کی للک میں، میں نے کئی اور سرٹیفیکیٹ کورسس کئے، مگر اچھی ملازمت کی خواہش خواب ہی رہی۔ پھر تھک ہار کر محکمہ جاتی مقابلے کا امتحان پاس کیا اور ترقی ہوئی۔ آج کل اکاؤنٹس آفیسر کی حیثیت سے سابقہ ٹی اینڈ ٹی اور موجودہ پی۔ ٹی۔ سی۔ ایل۔ میں کام کر رہا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتا ہوں کہ اس نے دولت و شہرت تو نہ دی، مگر عزت ضرور دی ہے اور وہ بھی دن رات محنت و مشقت اور دیانتداری سے کام کرنے کے باعث۔ میرا رزق اسی محکمے میں لکھا ہوا ہے، سو میں اس محکمے کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا تھا۔ میں نے بہتر ملازمت حاصل کرنے کی بڑی جدوجہد کی، مگر سفارش نہ ہونے کے سبب ناکام رہا۔ مگر اللہ کی رحمتوں سے مایوس کبھی نہیں ہوا اور مسلسل پڑھتا رہا۔ میرے تمام ساتھی اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ انھیں میں رشک کی نظر سے دیکھتا ضرور

ہوں، مگر اپنے حال میں مست رہتا ہوں کہ اب تھوڑی سی زندگی اور چند سال کی ملازمت باقی رہ گئی ہے، سو وہ بھی کٹ ہی جائے گی۔ قلم سے رفاقت کا ایک انعام یہ ملا ہے کہ:

میرا فرض اتنا کہ میں حرف کو سچائی دوں
کام اوروں کا ہے سچائی کو شہرت دینا
محشر بدایونی

غالباً ۱۹۶۰ء کے آخری عشرے میں والد صاحب ڈھاکے آگئے تھے پھر جب ۱۹۷۰ء میں وہاں ہنگامے شروع ہوئے تو میں نے اپریل کے آخری دنوں میں بھائی جان کی فیملی کے ساتھ انھیں کراچی بھیج دیا پھر کراچی کے لسانی ہنگاموں کے دوران ان کا انتقال ہو گیا اور وہ یہیں مدفون ہوئے۔ ایک بار پھر مسلسل دکھوں کی یورش اور حالات کی بے رحمی نے مجھے چپ سی لگا دی۔ میں گم صم رہنے لگا اور اس دکھ کو بھی نہ سمجھ سکا، جو آپ ہی آپ دل میں بسیرا کر بیٹھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہر شخص اپنی ذات میں بالعموم گم صم ہی رہتا ہے اور فکر کے جالے بنتا رہتا ہے، غالباً اسی سبب وہ شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے عہد اور اپنے ماحول سے بہت کچھ سیکھتا اور اخذ کرتا ہے۔ میں بھی اسی عمر سے تحصیل علم کی راہ میں گم صم بھٹکتا رہا۔ قوتِ گویائی کی بہت سی موجیں ذہن و ذات کے اندر تندیِ صہبا کی طرح اٹھتیں اور کنارِ لب تک آکر واپس ہو جاتیں۔ اندرونِ ذات، انسانی مجبوریوں، محرومیوں اور ناامیدیوں کی بہت سی کتھائیں کربِ کربلا کی طرح اظہار کو ترستی رہ جاتیں۔ دکھوں کی پے بہ پے ضربتوں نے دنیا کے نہ جانے کتنے ہی انسانوں کی طرح مجھے بھی گم صم کر دیا۔ باشعور اور حساس انسان کی ایک بڑی مجبوری تو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اندر کے کہرام کو بیان بھی نہیں کر سکتا، اس کربلا کی صعوبتیں کسی کو سنا بھی نہیں سکتا، جو اندر کی دنیا کو تہ و بالا کئے رکھتی ہیں.... ہر لمحے کچو کے سہتا ہے، مگر کہہ بھی نہیں سکتا۔ یہ کیسا عذاب ہے، یارو! جو جسم و جاں سے ہر لمحے نبرد آزما رہتا ہے۔

جب سے شعور کی آنکھ کھولی، اپنے گرد دکھوں کے جال کو پھیلا ہوا دیکھا۔ زمینداری ختم ہو چکی تھی، کھیت، جو رزق کا وسیلہ تھے، بوجوہ رہن رکھے جا رہے تھے، سفید پوشی کے بھرم کو برقرار رکھنا دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔ ضرورتوں کے بوجھ نے باپ کی کمر کو جھکا دیا تھا اور ماں کی آنکھوں میں خوابوں کے جھرو کے کھل گئے تھے، جس سے گم صم بیٹھی نہ جانے وہ کس دن کو یاد کرتی رہتی، حالانکہ اب تو اس کے بس میں نہ ماضی تھا، نہ حال اور نہ مستقبل۔ میری کہانی کے کسی

بے نام کردار نے ایک بار مجھ سے کہا تھا....

"شاید وہ شعور کا پہلا دن تھا، جب پاپڑ جیسی خشک روٹی کو نیم گرم پانی میں ڈبو کر میرے منہ میں ڈالا گیا تھا اور میری آنکھوں سے آرزوؤں کے گرم گرم خواب قطرہ بن کر میری ماں کے ہاتھوں پر ٹھہر گئے۔ ماں نے چمکارتے ہوئے، پیار سے اپنے ہاتھوں کے کشکول میں میرے رخسار کو تھام رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں، میں نے جو ستارے دیکھے تھے، وہ آج بھی میرے خوابوں کے آسمان پر روشن ہیں۔ مجھے وہ آنکھیں یاد ہیں، جن میں میرے آنے والے دنوں کے خواب تیر رہے تھے۔ باپ گم صم رہتا کہ زمین کا کوئی اور مالک بن بیٹھا تھا، مگر وہ اپنے کھیتوں کی روش سے گذرتے ہوئے اکثر نادیدہ خوابوں کی فصل کاٹتا۔ کسان سے جب اس کا کھیت چھن جائے تو اس کے پاس آنسوؤں کی جگہ خواب رہ جاتے ہیں، جو آنے والی نسلوں کو ورثے میں ملتے ہیں۔؟"

اگر غور کیا جائے تو خواب ہی آج کی نسل کو ورثے میں ملے ہیں۔ اس کی تمامتر جدوجہد کا حاصل بھی یہی خواب ہیں .... نہ اس کی اپنی زمین ہے اور نہ آسمان .... میں بھی اسی نسل کا ایک گمشدہ فرد ہوں، جس کا اصل میں کچھ بھی نہیں۔

اماں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور اپنی اس مٹی کو آنکھوں سے لگانے، جس سے میرا خمیر اٹھا تھا، میں ایک بار پرکھوں کی سرزمین پر گیا تھا، مگر وہاں نہ قبر ہی مل سکی اور نہ وہ عالیشان مکان، جس میں، میں نے آنکھ کھولی اور پلا بڑھا تھا۔ قبر کا نشان مٹ چکا تھا اور مکان کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے آثار اور آنگن کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بچ رہا تھا۔ مجھے بچپن بہت یاد آیا اور وہ آنگن، جس میں لیٹا میں آسمان کو دیکھا کرتا، اب سمٹ کر چند گز رہ گیا تھا۔ اس کے آس پاس مٹی کے تودے اور کھپریل کا ڈھیر تھا۔ میرے پاؤں اس زمین پر تھے یا نہیں، مجھے یاد نہیں .... اماں خیالوں میں سامنے کھڑی رو رہی تھیں، مجھے اپنی گود میں سمیٹنے کے لئے میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ آنگن میں چارپائیاں بچھی ہیں، ان پر سفید سفید چادریں لگی ہیں، بالٹی میں اپنے باغ کے سیندوری اور فجری آم بھگوئے ہوئے ہیں۔ آنگن ہی کے ایک مشرقی کونے کو گھیر کر چھوٹا سا باورچی خانہ بنا ہے، جہاں انوری آپا بیٹھی جو کی بڑی بڑی روٹیاں پکا رہی ہیں اور اماں کئی دالوں کو ملا کر پکی ہوئی گاڑھی "کیوٹی" دال کو اصلی گھی اور لہسن سے بگھار دے رہی ہیں۔ گوبر کے

اوپلے جل رہے ہیں، یا کبھی گیلی لکڑی کو پھوکنی سے پھونک پھونک کر کچی لکڑی کے دھوئیں سے آپا کی آنکھیں رونے لگی ہیں۔ چولائی کے ساگ کی سوندھی خوشبو آنگن میں پھیل رہی ہے۔ میں ایک کھری چارپائی پر لیٹا بھوک سے بلک رہا ہوں۔ بابا بنگلے کے باہر صحن میں نیم کے درخت کے نیچے بیٹھے محلے کے چند لوگوں کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں اور حقے کی گڑ گڑ فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی ہے۔ پرانے کنویں کی منڈیر سے ذرا پرے چند لڑکے اور محلے کی نوجوان لڑکیاں چاندنی رات میں اندھیرے اجالے کا کھیل کھیل رہی ہیں۔ ان کی چیخ و پکار اور بے ہنگم ہنسی کے شور سے پورا صحن گونج رہا ہے، ہلکی ہلکی ہواؤں کا مترنم شور نیم کے پتوں اور گھنی بسواڑی سے ابھر رہا ہے، پروائی سنک رہی ہے، جوان دل ہمک رہے ہیں۔ .... پھر یکبارگی تیز ہوا کا ایک جھونکا بسواڑی میں شور مچاتا ہوا آنگن میں در آیا اور مٹی کے تیل سے جلتی ہوئی لالٹین اوسارے کی کڑی سے لٹکی ہوئی ایک دم سے زمین پر اوندھی گر پڑی۔ میں چونک پڑا۔ میری ہچکی بندھ گئی تھی۔ میں جانے کیوں پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ سب خواب کی مانند لگ رہا تھا۔ آنسو کے چند قطرے یاد کنارے سے ڈھلک کر کھنڈر کی جاگتی زمین میں جذب ہو گئے اور میرے دل نے بے ساختہ آرزو کی کہ اس زمین سے اب جو نسل ابھرے، وہ میری طرح خانماں برباد نہ ہو اور اس کے مقدر میں میرے حصے کے ادھورے خواب نہ ہوں ....؟

خواب اور سوال صرف کئی نسلوں کا ہی نہیں، میرا بھی مقدر رہے ہیں اور میں ان سوالوں کے درمیان گھرا ہوا سوچ رہا ہوں، مجھے جواب کب ملے گا....؟ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں سوچنے لگتا ہوں، سوال ہی تو جستجو کی ردا اوڑھے سراغ منزل کا پتا دیتے ہیں۔ میں نے جس ماحول اور جن حالات میں آنکھ کھولی، وہاں میرے سامنے سوال ہی سوال تھے۔ پھر یہی سوال خواب بنتے گئے اور بالآخر اظہار کا لبادہ اوڑھے کہانی بن گئے اور میں قلم سے خواب بننے لگا.... میرے ایک کردار نے مجھے یاد دلایا....

"بچپن سے لے کر آج تک میں بھی خواب ہی دیکھ رہا ہوں۔ میرے دل میں بارہا یہ خواہش خواب کی طرح ابھری کہ میں ساری دنیا کے دکھ سمیٹ لوں اور اپنے اطراف پھیلے ہوئے انتشار کو امن کی جھولی میں ڈال لوں، مگر یہ بھی خواب ہے۔ ساری عمر قلم سے رفاقت کرنے کے بعد بھی مجھے کیا ملا.... خواب اور صرف خواب ....؟ معاشرے اور گھر والوں کی نظر میں میری کیا وقعت ہے؟ شاید میرے بچے اپنے خوشحال ساتھیوں کی صحبت میں بیٹھ کر مجھ سے نفرت کرتے

ہوں یا مجھے "ڈس اون" کرتے ہوں!"

میں کہانی خود نہیں لکھتا، بلکہ معاشرے میں پھیلے ہوئے ان سوالوں کا جواب تلاش کرتا ہوں، جو ہر لمحے میری روح کو مضطرب رکھتے ہیں۔ دکھ کی چادر اوڑھے میں نے اب تک جو کچھ بھی دیکھا ہے، اسے آپ کو بھی دکھانے کی کوشش کرتا ہوں .... اپنے احساس کی چھوٹی سی دنیا میں آپ کو لے جانا چاہتا ہوں .... اس درد سے آشنا کرنا چاہتا ہوں، جو ہمارے معاشرے کے بیشتر انسانوں کا مقدر ہے، حالانکہ میں یہ جانتا ہوں کہ میری "اس دنیا" میں آپ کو کچھ نہیں ملے گا، مگر آپ کچھ دیکھ ضرور لیں گے بس شرط اتنی سی ہے کہ آپ کی چشم، بینا ہونی چاہیے اور ذہن و دل کشادہ۔ بچپن سے میں "اس دنیا" میں ٹھوکریں کھا رہا ہوں، میرا احساس ریزہ ریزہ ہو چکا ہے، پھر بھی میں زندہ ہوں ہر نیا سوال مجھے نئی زندگی عطا کرتا ہے اور اس کے جواب کی جستجو میرے قدم تھکنے نہیں دیتی۔

کبھی کبھی غور و فکر کے درمیان ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب خیال بولنے لگتے ہیں اور کہانی خود اپنے آپ کو بیان کرنے لگتی ہے، پورے شد و مد کے ساتھ ذہن تخلیق کے عمل میں مصروف ہو جاتا ہے، ایک ترتیب کے ساتھ جملے عبارت میں ڈھلنے لگتے ہیں اور وجود سراپا خیال کے تابع ہو کر ماورائیت کی سرحدوں سے جاملتا ہے۔ یہ کیفیت اتنی بے ساختہ اور بے ارادہ ہوتی ہے کہ اس پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لمحے کو گرفت میں لانا تخلیق کار کا اصل کام ہوتا ہے۔ ہر تخلیق کار کی طرح مجھ پر بھی یہ کیفیت بارہا گزری ہے، فکر و خیال میں چراغاں سا ہوا ہے۔ کوئی واقعہ، کوئی خیال، درد کی کوئی کسک، احساس کو چھو کر اس لمحہ بے نام کو زندہ کر گئی ہے اور جب بھی یہ "لمحہ زندہ" میری گرفت میں آیا ہے تو کہانی تخلیق ہوئی ہے۔

ابتدا میں مجھے موضوع کا انتخاب کرنے کے بعد پلاٹ کی ترتیب کا مرحلہ درپیش رہتا۔ کہانی کا آغاز چونکا دینے والے جملے سے کرنا نہایت دشوار معلوم ہوتا۔ پھر ارتقا اور اختتام تک پہنچنے میں خاصی پریشانی لاحق رہتی۔ وحدتِ تاثر کا بھی خیال رکھنا پڑتا اور یہ بھی سوچنا پڑتا کہ افسانے میں کوئی واقعہ ایسا نہ ہو، جو مرکزی خیال یا موضوع کو آگے بڑھانے میں رکاوٹ بنے۔ ناول کے مقابلے میں افسانے میں توجہ کا انتشار اس کی مجموعی فضا کو غارت کر دیتا ہے۔ افسانے میں شروع سے آخر تک دلچسپی کو برقرار رکھنا بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ افسانے کا پہلا ہی فقرہ اتنا دلچسپ ہونا چاہئے کہ قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلے اور اسے پڑھنے پر مجبور کردے۔

اچھی کردار نگاری کا ایک عام معیار یہ ہے کہ اس میں خاص کردار کی جگہ عام کرداروں کو

اہمیت دی جائے ۔ یہ کردار عام زندگی سے لئے جاتے ہیں اور عام انسانوں کی طرح چلتے پھرتے ، ہنستے بولتے ، اپنی تمامتر خوبیوں اور خامیوں سمیت نظر آتے ہیں ۔ ناول میں کردار نگاری کی گنجائش افسانے سے کہیں زیادہ ہوتی ہے ، کیونکہ ناول کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے ۔ اس میں زندگی کو اس کے کل میں پیش کیا جاتا ہے ، جبکہ افسانے میں کردار کے کسی ایک پہلو ہی کو نمایاں کر کے پیش کیا جاتا ہے ۔ اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن نہیں ۔ مکالمہ بھی ناول کی طرح افسانے کا ضروری عنصر ہوتا ہے ۔ اس کے ذریعے کردار پوری طرح بے نقاب ہو کر قاری کے سامنے آتا ہے ، مگر مکالے کی کمی یا زیادتی ، موضوع پر منحصر ہوتی ہے ۔ افسانے میں اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ وہ یا تو تمامتر مکالماتی ہو یا پھر تمامتر واقعاتی ہو..... ہاں! البتہ موقع ، محل کی مناسبت کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے ۔ افسانے کا اختتام ایسا ہونا چاہئے ، جس سے مرکزی موضوع یا خیال کی طرف ہماری توجہ مبذول ہو جائے ۔ نقطہ عروج تک پہنچنے کے فوراً بعد افسانے کا خاتمہ جلد آنا چاہئے ، ورنہ افسانے کا مجموعی تاثر کم ہو جائے گا ۔

کہانی کو پوری طرح ترتیب دینے ہی سے کام نہیں چل جاتا ، بلکہ اس کی روح میں اتر کر اس کی تخلیق ہی اسے عظمت بخشتی ہے ۔ ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے ، جب ہم اپنے کرداروں کی جبلی خصوصیات کو پیشِ نظر رکھ کر افسانہ تخلیق کریں ۔ افسانہ نگار میں وہ صلاحیت ہونی چاہئے ، جو ماحول کی پوری جزئیات کو گرفت میں لینے پر قادر ہو ۔ ایسا پیش منظر قاری کو اس کے اپنے بہت سے تجربات یاد دلاتا ہے اور یہی مماثلت کہانی کو گہرائی عطا کرتی ہے :

کہانی مجھ کو رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے ، اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

افسانے کے موضوعات کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کے لئے کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں ہے ۔ کوئی اہم واقعہ ، متاثر کرنے والا حادثہ ، کردار کا کوئی خاص رخ ، کسی تجربے کا کوئی حصہ ، زندگی کا کوئی پہلو ، کوئی اخلاقی مسئلہ یا کوئی دردانگیز لمحہ ، افسانے کا موضوع بن سکتا ہے ۔ بعض افسانے واقعات پر ، بعض کردار نگاری پر اور بعض خاص طرح کی فضا پر منحصر ہوتے ہیں ، مگر بہتر یہ ہے کہ افسانے میں ایسی فضا پیدا کی جائے کہ واقعات اور کردار ، دونوں ہی ایک خاص موقع پر آکر کمتر معلوم ہونے لگیں اور مجموعی تاثر اسے کہیں سے کہیں پہنچا دے ۔ اگر ایک افسانے کا بھرپور تاثر ذہن پر مرتسم ہو جائے اور بھلائے نہ بھولے تو ایسا ہی افسانہ یادگار بن جاتا ہے اور اس میں

ہمیشہ زندہ رہنے کی سکت باقی رہتی ہے۔

اب افسانے کا دامن بہت وسیع ہو چکا ہے۔ اس میں بڑا تنوع پیدا ہوا ہے۔ اس کے بندھے ٹکے اصولوں سے روگردانی بھی کی گئی ہے اور اس کے دامن میں طرح طرح کی کہکشائیں بھی روشن ہوئی ہیں۔ علامتی، تجریدی اور ابہامی تحریروں کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ انسانی ذہن نے جس تیزی سے ترقی کی ہے، اس سے کہیں زیادہ اصنافِ ادب کے پیمانوں میں تغیر و تبدل آیا ہے۔ سائنسی تبدیلی کے زیرِ اثر انسانی ذہن نے فکر کے نئے پیکر تراشے ہیں اور اظہار کے نئے پیمانے وضع کئے ہیں۔ آج افسانہ انھیں پیمانوں پر جانچا جاتا ہے۔ کہانی کی گمشدگی کا دور بالآخر اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکا ہے اور کہانی بازیافت ہو گئی ہے، مگر روایتی انداز فی زمانہ اپنے اندر وہ جاذبیت نہیں رکھتا۔ آج کا قاری اتنا ذہین ہے کہ وہ علامتوں کی زبان سمجھنے لگا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ احساس کی گہرائی میں ڈوب کر دل پر اثر کرنے والی بات کو اگر موثر انداز میں تخلیق کے قالب میں ڈھالا گیا ہو تو وہ ضرور اثر انداز ہوگی، خواہ یہ تجریدی یا علامتی انداز میں ہی کیوں نہ کہی گئی ہو۔ کمال تو جب ہے کہ کہانی میں استعارے بھی بولنے لگیں۔ میری کچھ کہانیوں میں آپ کو یہ کیفیت محسوس ہوگی۔

میں نے جب کہانی لکھنے کی ابتدا کی تو سکہ رائج الوقت کے مطابق میری کہانیوں نے تخلیق کا روپ دھارا اور میں نے بھی انھیں اصول وضوابط کی پابندی کی، جن کا ذکر میں نے سطورِ بالا میں کیا ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں بیانیہ یا بیان کے انداز کی کہانیوں کا چلن عام تھا۔ منٹو، بیدی، احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، ابوالفضل صدیقی اور شوکت صدیقی کے افسانوں نے جہاں متاثر کیا، وہیں اپنے ہمعصر افسانہ نگاروں، مثلاً محی الدین نواب، شہزاد اختر، ذاکر عزیزی، شہزاد منظر، غلام محمد، زین العابدین، شبنم یزدانی، نورالہدیٰ سید، شاہد کامرانی، محمود واجد، امِ عمارہ اور علی حیدر ملک کی کہانیوں نے ذہن کو جلا بخشی۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی کا یہی وہ زمانہ ہے جب ادب میں جدیدیت کی "پروائی" چلی اور ڈاکٹر وزیر آغا کو پاکستانی افسانہ نگاروں کے ہجوم میں جدید طرز کے چند افسانہ نگار نظر آئے۔ جن میں انتظار حسین کے ساتھ ڈاکٹر انور سجاد اور رشید امجد کو خصوصی توجہ حاصل ہوئی۔ انتظار حسین نے داستان سے اپنا رشتہ استوار رکھا۔ جبکہ باقی دو نے حال کے نقطہ پر کھڑے رہ کر ماضی اور مستقبل دونوں سے رابطہ قائم کیا اور جدید طرزِ اظہار کے ذریعہ علامتوں اور استعاروں کی زبان میں بات کی، جس کا ایسا غوغا مچا کہ کہانی نے اپنے بطون

کو تیاگ کر نیا جون اختیار کر لیا اور فرد کی ذات کا المیہ، قصہ بن گیا۔ اس تازہ "پروائی" کے نشے میں ہر نیا لکھنے والا مست نظر آنے لگا اور معاشرے کی پیتا بھولی بسری داستان بن گئی۔ اس کے اثرات چار دانگ عالم میں پھیل گئے۔ یہ "پروائی" سرحد پار کر گئی۔ سریندر پرکاش اور بلراج مینرا کے علاوہ کئی دوسروں نے جدید فکر کے نئے رجحانات کو لبیک کہا اور خوبصورت کہانیاں تخلیق کیں۔ کافی عرصہ تک نئی کہانی "پروائی" کے دوش پر کو بکو پھرتی رہی اور گلی کوچوں میں بکھری ہوئی کہانیاں اپنے اظہار کو ترستی رہیں۔ ان رہ گذاروں سے گذرنے کی جیسے، ہمت ہی جواب دے گئی تھی۔ حالانکہ ایسا ازبس ضروری تھا۔ نئی کہانی کے اس چلن نے دل میں خوف بھر دیا تھا اور بیانیہ کہانی لکھتے ہوئے عجیب طرح کا احساس ہوتا۔ جیسے تمام سکے کھوٹے ہوگئے ہوں۔ مگر پھر رفتہ رفتہ برسوں کی مسافت طے کرنے کے بعد تکان کا احساس بڑھتا گیا اور بالآخر وہ منزل آگئی جہاں پر پڑاؤ لینا پڑا۔ "پرانی کٹیا" میں جلتے ہوئے دیئے کی لو ابھی تک تازہ دم تھی اور قافلہ سالاروں کو نئی صبح کی بشارت دے رہی تھی۔ کہانی کی بازیابی کے چرچے عام ہو رہے تھے۔

مشرقی پاکستان کے ان افسانہ نگاروں نے، جن میں کچھ بہت سینئر افسانہ نگار مثلاً افسر ماہ پوری، ایاز عصمی، شبیر علوی، احمد سعدی وغیرہ بھی شامل ہیں، اپنی دنیا آپ پیدا کی اور کہانی کی اس روایت کو آگے بڑھایا، جو پریم چند سے شروع ہوئی تھی۔

میں نے بھی نئے رجحانات کے زیر اثر کچھ تجریدی اور علامتی کہانیاں لکھیں (جو اس مجموعے میں شامل ہیں)، مگر ایسی علامتی کہانیاں لکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی جو سر سے گذر جائیں کیونکہ ایسی کہانیاں میرے مزاج سے لگا نہیں کھاتیں۔ ایک بار اپنے آپ کو اس آزمائش میں ڈالا بھی تھا۔ لیکن بات نہ بن سکی۔ اس کہانی کا عنوان "اندھیرے میں سبز کونپل" ہے اور جو اس مجموعے میں شامل ہے۔ اسکی ابتدا کچھ یوں ہوئی ہے:

> "اندھیرے روشنی کی پیاس لئے اس کھڑکی تک آ پہنچے تھے، جہاں میں اپنے دونوں ہاتھ کھلے پٹ پر رکھے گردن نیوڑھائے صلیب بن گیا تھا۔ علامتوں کی جستجو میں، نئے سفر کی آرزو میں "پرانے گھر" سے میں نے اپنا ناتا توڑنا چاہا، مگر اس سفر کی صعوبتوں نے مجھے عیسیٰ بنا دیا اور گھٹا ٹوپ اندھیرے لشکر کی مثال میری طرف یوں بڑھے، جیسے دم زدن میں مجھے سنگسار کر کے لہولہان کر دیں گے اور میں اپنوں ہی کے ہاتھوں مصلوب کر دیا جاؤں گا۔"

اس میں آپ تخلیق کار کی اس کشمکش کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں، جو ایک فرد کی ذہنی روئیداد کی غماز ہے۔ وہ کوشش کے باوجود علامتوں کو اجتماعیت کی وہ زبان عطا نہیں کر سکتا، جو سب کے دکھ کو سمیٹ سکیں۔ یہاں فرد کی ذات کا مسئلہ اپنی جگہ، مگر وہ اجتماع سے اپنے آپ کو الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا کہ وہ اسی معاشرے کا ایک حصہ ہے، یا یوں سمجھئے:

فرد قائم ربط ملت سے ہے ، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اس مجموعے میں شامل دیگر کہانیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا کہ ان کے متعلق کچھ کہنے کا اختیار میں آپ کو سونپتا ہوں۔ میں نے کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ ہاں! اتنا ضرور ہے کہ اپنے گرد و پیش میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا ہے، اسے آپ کے احساس کا حصہ بنانے کی ادنیٰ سی کوشش کی ہے۔ جس دردمندی سے میں نے لمحہ موجود کی چھوٹی سے چھوٹی واردات یا واقعے کی کربناکی کو محسوس کیا ہے، اسے آپ تک کبھی بیان کے انداز (بیانیہ) میں، کبھی تجریدی یا علامتی انداز میں پہنچانے کی سعی کی ہے۔

میں ایک ایسے غریب معاشرے کا فرد ہوں، جس میں اقدار کی شکست و ریخت اور طبقاتی کشمکش کا عمل مسلسل جاری ہے۔ انسان ہر لمحے نئے نئے تضادات سے نبرد آزما ہو رہا ہے۔ بے حسی اور بے یقینی اس معاشرے کا خاصہ بن چکی ہے۔ کوئی ایک دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کرنے کا روادار نہیں۔ ایسی نفسا نفسی اور آپا دھاپی کا دور آگیا ہے کہ انسان، انسان سے یکسر لاتعلق ہوتا جا رہا ہے، مصائب و آلام اور دکھ درد سب کا مقدر بن کر رہ گئے ہیں۔ ایسے معاشرے کی بپتا سنانا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں، اگرچہ

فن کے پیمانے سبک ، حرف کے کوزے نازک
کیسے سمجھاؤں کہ کچھ دکھ ہیں ، سمندر میرے
محشر بدایونی

"دریچے میں بجی حیرانی" کی ترتیب سے اشاعت تک کی کٹھن منزلوں سے گذرتے ہوئے جن احباب کی رفاقت نے کڑی دھوپ میں سائبان فراہم کیا ہے اور جن کے مفید مشوروں نے تاریک راہوں میں شعاعِ نور کا کام کیا ہے، ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کرنا میں اپنا خوشگوار فریضہ

سمجھتا ہوں۔ نادانستہ طور پر کوئی نام چھوٹ گیا ہو یا کوئی بات رہ گئی ہو تو اس سے میرے خلوص نیت پر شک نہ کیا جائے۔

استادِ محترم پروفیسر ڈاکٹر حنیف فوق کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی نے ہر قدم پر سہارا دیا اور اس مجموعے کی اشاعت کی ترغیب دی۔ انھوں نے جس محبت سے اس مجموعے کا پیش لفظ لکھا اور میری جملہ کہانیوں کو اپنی تنقیدی بصیرت کے نور سے منور کیا، اس کے شکریئے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

محترم پروفیسر سحر انصاری نے جس خلوص اور محبت سے میری کہانیوں کو سراہا اور میرے خوابوں کو تعبیر آشنا کیا، اس کے لئے میں حرفِ سپاس کہاں سے تلاش کروں کہ سحر بھائی کی سحر انگیز اور محبت آمیز شخصیت کی گھنی چھاؤں میں رہ کر میں کچھ نئے خواب بننا چاہتا ہوں۔

محترم بھائی احمد یوسف نے میری کہانیوں کا تجزیہ پیش کر کے میرے حوصلے کو بلند کیا ہے۔ میں ان کی محبتوں کو بھی سلام پیش کرتا ہوں۔

محترم شوکت صدیقی نے، جو ہمارے افسانے اور ناول کی آبرو ہیں، میرے افسانوں کے مطالعے کے بعد جو بصیرت آموز نتیجہ اخذ کیا ہے، اسے مختصر رائے کے طور پر فلیپ کے لئے میری خواہش کے مطابق قلمبند کر دیا ہے۔ اسے میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں اور ان کا بے حد ممنون ہوں۔

محترم ڈاکٹر وزیر آغا نے میری کہانیوں میں دردمندیوں کو جس اخلاص و محبت سے محسوس کیا ہے، اسے مختصر آ اپنے مخصوص انداز میں رقم کر دیا ہے اور میری دیرینہ آرزو کو تکمیل آشنا کر کے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ میں آغا صاحب کی اس دل نوازی کا شکریہ کیسے ادا کروں کہ میرے پاس اس کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔

ملک کے مایہ ناز مصور اور خطاط محترم جناب بشیر موجد نے، جن کو میں اپنا محسن اور رفیقِ دیرینہ سمجھتا ہوں، اس کتاب کے سرورق کو اپنے موقلم کی ہنرمندی سے جو زینت بخشی ہے، اس کے لئے میں ان کا ممنون کرم ہوں۔ ان کی محبت اور خلوص بے پایاں، میری یادوں کو ہمیشہ منور رکھے گا۔

محترم جناب نکہت بریلوی، جناب صہبا لکھنوی، جناب احمد ہمش، جناب حسین انجم اور بھائی مسلم شمیم کے گرانقدر مشوروں اور تعاون کا میں تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

میرے قریبی احباب میں فکشن گروپ کے ساتھی اور رفیق کار، جناب پروفیسر علی حیدر ملک، اے۔ خیام، صبا اکرام، شہزاد منظر، ڈاکٹر محمد رضا کاظمی، شاہین بدر، یاور امان، کلیم رحمانی، اور اقبال مجیدی نے جس طرح تعاون اور رہنمائی کی اور مختلف صورتوں سے رفاقت کا جو حق ادا کیا، میں ان سب کے مخلصانہ تعاون کا منت پذیر ہوں۔

میں اپنے ابتدائی ایام کے افسانہ نگار دوستوں اور ہمعصروں، شہزاد اختر، غلام محمد، زین العابدین، مسعود شہریار، محترمہ ام عمارہ، ذاکر عزیزی، سوز حیدر آبادی مرحوم اور محی الدین نواب کی دیرینہ رفاقت اور بے لوث محبت کی بھی دل سے قدر کرتا ہوں اور مشرقی پاکستان مرحوم کی خوشگوار یادِ ایامِ رفتہ کو اپنے دل کے نہاں خانے میں منور پاتا ہوں اور اسے جانِ عزیز کا بے بہا سرمایہ تصور کرتا ہوں۔

نواب پور گورنمنٹ ہائی اسکول کے تمام قریبی ساتھیوں، بالخصوص خورشید احمد مرحوم، مطیع الرحمان، سید نقوی، نذر عباس مرحوم، مہر الدین مرحوم، جمال احمد صدیقی، شاہ ابو شیث سلیم الدین، عبدالرزاق، مہدی امام، سید محمد معصوم، انور حسین، فیروز الدین احمد، انور فرہاد (معین الدین ہدف) ضیا احمد وارثی اور زاہد حسین کا بے حد ممنون ہوں کہ ان کی کوششوں نے میرے تحصیل علم کی راہ کی دشواریوں کو آسان کر دیا، میری علم کی پیاس کو کبھی نہ بجھنے دیا اور میری افسانہ نگاری کے شوق کو جلا بخشی۔

آخر میں مشرقی پاکستان کے اپنے ان بزرگ کرم فرماؤں اور دوستوں، محترم صلاح الدین محمد، نقی مصطفیٰ، محترمہ بانو اختر شہود آپا، سہیل ادیب، عطاالرحمان جمیل، ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی احمد سعدی، حیدر صفی، احمد الیاس، افسر ماہ پوری مرحوم، اختر لکھنوی مرحوم، پروفیسر اظہر قادری شاعر صدیقی، شفیق احمد شفیق، ایوب جوہر (استادِ محترم ڈاکٹر عندلیب شادانی نے تحصیل علم کی دشوار گزار راہوں کو اپنی زباں دانی، اور علمی بصیرت کے نور سے جس دل نشین انداز میں منور کیا اور میرے ادبی ذوق کو جس طرح فزوں تر کیا، اسے میں اپنے لئے ایک بیش بہا سرمایہ تصور کرتا ہوں) اور دیگر تمام حضرات کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں۔

پیکرِ خلوص "جگت استاد" نوشاد نوری (جنھوں نے میری کہانی "نورا" کو اپنے زوردار قہقہوں کی گونج میں جس طرح سراہا اور پورے شہر ڈھاکا میں اس کی جس انداز سے تعریف کرتے پھر رہے تھے، اس سے یہ گماں ہوتا جیسے شہر میں کوئی بڑا واقعہ ہو گیا ہو حالانکہ ایسا نہیں تھا) کا بھی

شکریہ ادا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ ان کی ابتدائی حوصلہ افزائی نے میرے ادبی ذوق کو استقامت بخشی۔

اس کتاب کی تزئین کے سلسلے میں خوش نویس جناب عبدالرحیم انصاری اور ٹی۔ ایچ نقوی نے جس انہماک سے کام کیا، ان کا بھی بے حد ممنون ہوں۔

میری یادوں نے مجھ سے جو کہا تھا اور میرے ذہن کے دریچے سے تخئیل کی جس دنیا کا نظارہ کیا تھا، اس کی ایک جھلک میں نے پوری دیانتداری کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر دی۔ اس تحریر کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ اس کے ذریعے ان عوامل کو سمجھنے میں آسانی ہو، جو مجھے افسانہ نگاری کی طرف مائل کرنے کا باعث بنے، دوسرا یہ کہ زندگی کے گوناگوں تجربوں اور مشاہدوں نے جس طرح شمع احساس کو ہر لمحے فروزاں رکھا، اس نے سوچ اور فکر کو مقدر بنا دیا۔ یہ حالات ہی ہوتے ہیں، جو انسان کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ دکھ شعور کا حصہ بن کر انسان کو غور و فکر پر مجبور کرتا ہے، جس کا اظہار ادب کی کسی صنف کے ذریعے ہوتا ہے۔ ابتدا سے لے کر اب تک کے حالات کا ذکر میرے ذہنی سفر کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ دکھوں کی مسلسل یورش اور ناگفتہ بہ حالات کے باوجود میں کبھی زندگی سے مایوس نہیں ہوا اور ہر لمحے ایک نئی جستجو میری زندگی کا حاصل رہی۔ یہ ساری باتیں آپ کو کیسی لگیں، اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں کہ یہ آپ ہی کا حق ہے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ:

جستجو زندگی کا حاصل ہے
اٹھ گیا جو قدم، وہ منزل ہے
مجنوں گورکھپوری

اے۔ ۸، ندیم کارنر، بلاک "این" نارتھ ناظم آباد،
کراچی، نزد ڈی۔ سی سنٹرل آفس، کراچی ۷۴۷۰۰
فون گھر: ۶۶۴۵۱۷۷، ۶۶۷۹۷۹۶

احمد زین الدین
15-12-96
(احمد زین الدین)

"میں کہانی خود نہیں لکھتا، بلکہ معاشرے میں پھیلے ہوئے ان سوالوں کا جواب تلاش کرتا ہوں، جو ہر لمحے میری روح کو مضطرب رکھتے ہیں - دکھ کی چادر اوڑھے میں نے اب تک جو کچھ بھی دیکھا ہے، اسے آپ کو بھی دکھانے کی کوشش کرتا ہوں - اپنے احساس کی چھوٹی سی دنیا میں آپ کو لے جانا چاہتا ہوں، اس درد سے آشنا کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے معاشرے کے بیشتر انسانوں کا مقدر ہے، حالانکہ میں یہ جانتا ہوں کہ میری "اس دنیا" میں آپ کو کچھ نہیں ملے گا، مگر آپ کچھ دیکھ ضرور لیں گے بس شرط اتنی سی ہے کہ آپ کی چشم بینا ہونی چاہئے اور ذہن و دل کشادہ -"

"مسلسل دکھوں کی یورش اور حالات کی بے رحمی نے مجھے چپ سی لگا دی - میں گم صم رہنے لگا اور اس دکھ کو بھی نہ سمجھ سکا، جو آپ ہی آپ دل میں بسیرا کر بیٹھا تھا - میرا خیال ہے کہ ہر شخص اپنی ذات میں بالعموم گم صم ہی رہتا ہے اور فکر کے جالے بنتا رہتا ہے، غالباً اسی سبب وہ شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے عہد اور اپنے ماحول سے بہت کچھ سیکھتا اور اخذ کرتا ہے -

"وقت کے ساتھ ساتھ آدمی بتدریج فطرت اور اُس کے مظاہر سے دُور ہٹتا چلا گیا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ دونوں میں ظالم اور مظلوم کا رشتہ اُبھر آیا ہے۔ احمد زین الدین نے اپنے خوب صورت اور خیال انگیز افسانوں میں اِس "رشتے" کو بڑی خوبی سے اُجاگر کیا ہے بلکہ ایک قدم آگے بڑھا کر اس تناؤ کو بھی موضوع بنایا ہے جو خود اِنسان اور انسان میں بڑھتا چلا گیا ہے۔

آج آدمی ایک عجیب دوراہے پر کھڑا ہے۔ ایک طرف اُس نے زندگی کے دیگر مظاہر کا بُری طرح استحصال کیا ہے (حتیٰ کہ اُس گھونسلے کو بھی تنکا تنکا کرنے کی ٹھان رکھی ہے جس میں زندگی پروان چڑھتی ہے) اور دُوسری طرف اُس نے خود اپنی فطرت کے خلاف ایک مُہم جاری کر کے خود کو دو نیم کر دیا ہے۔ احمد زین الدین نے اپنے افسانوں میں دردمندی کی ایک ایسی فضا اُبھاری ہے جو نہ صرف جوڑنے اور مربُوط کرنے میں مددگار ہے بلکہ پُوری زندگی کو ایک برادری میں منتقل کرنے کی بھی آرزو مند ہے۔

احمد زین الدین ایسا حساس اور درد مند انسان ہی زندگی کے مختلف مظاہر کو ایک دھاگے میں پرونے کا سوچ سکتا ہے اور اُس پاگل پن کو بے نقاب کر سکتا ہے جس میں مُبتلا ہو کر اِنسان فطرت کے ساتھ ساتھ خود کو تہہ تیغ کر رہا ہے۔"

(ڈاکٹر وزیر آغا)